مذہب اور زندگی

تحریر
سیّد کاظم نقوی
(نجف اشرف)

قیمت ایک روپیہ صرف

امامیہ مشن پاکستان لاہور

کے سلسلہ اشاعت کا ایک سو انتیسواں انمول شاہکار" مذہب اور زندگی" آپ کے زیر نظر ہے جسے پہلی بار شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

تعلیمات اسلام قیامت تک کے لئے باعث رشد و ہدایت ہیں اسلام کے حقیقی رہنمایاں سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام نے اپنے اپنے دور میں تمام علوم کے بارے میں آج سے سینکڑوں برس پہلے وہ وہ انکشافات کئے ہیں جنہیں آج سائنس دان انتہائی ترقی کے مدارج طے کرنے کے بعد معلوم کر رہے ہیں جہاں یہ بات چہاردہ معصومین علیہم السلام کی عظمت و حقانیت کو ثابت کرتی ہے وہاں ان حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ بھی ہے جو دن رات اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت مغرب کی ترقیوں کا گن گاتے رہتے ہیں۔ مغرب والے اس وقت تاریکیوں کے اتھاہ سمندر میں غرق تھے جب مسلمان دنیا بھر میں ہر قسم کے علوم کی نشر و اشاعت کر رہے تھے۔ زیر نظر کتاب میں فاضل جلیل جناب مولانا سید کاظم نقوی صاحب قبلہ لکھنوی مدظلہ العالی نے اختصار کے باوجود نہایت وقیع انداز میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ قبلہ مولانا ممدوح خاندان اجتہاد کے ایک ہونہار فرد اور سرکار سید العلماء مدظلہ کے برادر خورد ہیں آپ اس وقت نجف اشرف عراق میں دینی تعلیم کے آخری مراحل طے کر رہے ہیں موصوف نے اس مفید پیش کش کو اشاعت کیلئے مرحمت فرماتے ہوئے ہم پر یہ پابندی عائد فرمادی تھی کہ ہم سرورق پر ان کے نام کیساتھ کسی قسم کا بھی القاب وغیرہ شائع نہیں کرینگے چنانچہ ہم نے تعمیل حکم کی سعادت حاصل کی ہے امید ہے کہ مولانا صاحب کا یہ عمل پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا۔ افراد ملت کی خدمت میں درخواست ہے کہ اس مفید رسالے کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لیکر ثواب دارین حاصل کریں۔ شکریہ

آنریری جنرل سکریٹری

مذہب اور زندگی

گذشتہ دو تین صدیوں میں صنعت و حرفت اور علوم طبیعی نے جو غیر معمولی، حیرت انگیز ترقی کی اس نے انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی بہت سی گتھیاں سلجھا دیں، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں بڑی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ کارگاہ ہستی کی مختلف چھپی ہوئی آوارہ قوتیں انسان کے شکنجۂ اختیار میں آ گئیں۔ باہمی تعلق و ارتباط کے لئے تیز اور آسان وسیلے نکل آئے۔ تعلیم کے عام ہو جانے سے عوام روشن فکر اور روشن دماغ ہو گئے۔ ضروریاتِ زندگی کی تیاری کا بھاری بوجھ صنعتی کارخانوں کے کاندھوں پر آ گیا۔ کائناتِ عالم کی بیشتر صلاحیتوں کی کھوج کر کے انہیں انسان کے راحت و آسائش میں خرچ کیا گیا۔

حیاتِ انسانی کے آسمان پر تمدن و تہذیب کے ان روشن درخشاں

ستاروں کی تابندگی نے ہر شخص کی نگاہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔ ہر ایک آرزو کرنے لگا کہ اب پوری دنیائے انسانیت ہمہ گیر راحت و آسائش مستقل امن و اطمینان کی چھاؤں میں زندگی بسر کرے گی۔ خوش بختی بدبختی کی جگہ، راحت و مسرت زحمت و رنج کی جگہ، صلح و سلامتی فتنہ و خون ریزی کی جگہ لے لے گی، علم و تمدّن کے سورج کی تیز کرنیں دنیا کے چپہ چپہ سے جہالت و بربریت کے اندھیرے کو دور کردیں گی۔

سائنس کی ناقابل انکار عظیم کامیابی کے ان مزعومہ نتائج کا خوشگوار خواب انسان بڑے شوق سے دیکھ رہا تھا، وہ بیحد خوش تھا اور اپنی کامیابی پر نازاں کہ میری دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔ لیکن اُسے اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جب صنعت اور علوم طبیعی کی ترقیوں کے تباہ کن اور ہولناک نتائج مجسم ہوکر اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ انسان ابھی اطمینان کی بھرپور سانس نہ لینے پایا تھا وہ ان خوفناک نتائج کی روک تھام کا کوئی بندوبست نہ کرسکا تھا کہ عالمگیر صنعتی جنگ کے جہنمی شعلوں نے ان انسانی آبادیوں کو جھلسا کر رکھ دیا جنہیں تہذیب و تمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ سائنسدان اور موجدین تجربہ گاہوں کے اندر اپنے ایجادات کی تکمیل میں مصروف تھے کہ ان کے نتائج افکار تباہ کن اسلحہ کی شکل میں میدانِ جنگ میں لائے گئے۔ ہوائی جہاز بجائے اس کے کہ مسافروں کے نقل و حمل اور ضروریاتِ زندگی کو ڈھونے میں کام آئیں

آبادیوں کو کھنڈر بنانے کے لئے بم لے کر اُڑنے لگے۔ ایٹم کی غیر معمولی عظیم طاقتیں انسانیت کے سود و بہبود میں صرف ہونے سے پہلے اُس کی تباہی و بربادی کی غرض سے تیار کی گئیں۔ نقل و حمل کی غیر معمولی سہولتوں سے فائدہ پہونچنے کے بجائے قوموں کے درمیان ایک دوسرے کی طرف سے بے اطمینانی اور بے اعتمادی بڑھ گئی۔ دنیا کے دور و دراز کسی خطہ میں اگر اپنی منفعت کا تصوّر ہے تو اُس کے حصول تحفظ کے لئے ہر ایک آمادہ اور تیار نظر آنے لگا۔

علوم طبیعی کے ان ہمت شکن نتائج سے متاثر ہو کر بعض لوگ بجائے آگے بڑھنے کے اُلٹے پیروں پیچھے لوٹنے کا تصوّر کرنے لگے۔ لیکن بھلا انسان اس راستہ سے کہاں پلٹ سکتا ہے جس کو زبردست زحمت و مشقت کے بعد بڑے شوق سے اختیار کیا ہو۔ جس پر چلنے سے بہت سے لذیذ خوشگوار فائدے بھی اٹھا چکا ہو۔ ایٹمی تجربات کے موقوف کرنے یا تخفیف اسلحہ کی بابت کبھی کبھی جو آوازیں بلند ہوتی ہیں ان کے معنی یہی ہیں کہ انسان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ سائنس کے بام عروج سے نیچے اُتر آئے۔ انسان کو اگر یہ تجربات ممنوع ہی قرار دینا ہوتے تو وہ ایٹم کی کھوج میں مستقل دردسری کیوں مول لیتا۔ اُسے اسلحہ میں تخفیف بھی کرنا ہوتی تو ان کی تیاری میں اپنا قیمتی اور پیسہ کیوں صرف کرتا؟

بلاشبہ اقوام عالم کے مفادات کا دائمی ٹکراؤ، بین الاقوامی معاملات کا عدم توازن، کسی موجودہ صورت حال پر عدم اطمینان، ہمہ گیر خوف وہراس

عمومی بے اعتمادی اور بے اطمینانی، ہر طرف خود غرضی اور خود خواہی اس تہذیب و تمدّن کے نتائج و برکات ہیں۔

اگر دنیا کے کسی گوشہ میں دو برسرِ اقتدار فریقوں کے درمیان معمولی سی جھڑپ ہو جاتی ہے تو عالم کے ہر گوشہ میں نمایاں بدنظمی، افکار و نظریات میں، سیاسی شخصیتوں اور ان کی جماعتوں میں، بازار اور مختلف اجناس کے نرخوں میں، حکومتوں اور سلطنتوں کے اندرونی حالات و کوائف میں خاصی تہ و بالگی پیدا ہو جاتی ہے۔

دو طاقتور حریفوں کے درمیان ہلکے سے تصادم سے ایک مہیب ہولناک، عالم سوز جنگ کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ ایسی جنگ وتہذیب و تمدّن کو قبر میں ہمیشہ کے لئے سلا کر ختم ہونے والی ہے، جو اگرچہ وقتی طور سے اپنی بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے لیکن اس کی دہشت سے چھا جانے والی چہروں کی زردی دوام حاصل کر لیتی ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے زندگی کے سبز و شاداب گلشن کو دائمی اور ناقابلِ مصالحت میدانِ جنگ بنا دیا ہے۔ اس افسوسناک صورت حال نے فلاسفہ اور مفکرین تک کو متاثر کر دیا۔ ان کے ذہن ان پیداشدہ حالات کو مسلّم مستقل علمی و طبیعی اصول و قوانین کے قالب میں ڈھالنے لگے۔ انہوں نے "تنازع للبقا" "انتخاب اصلح" "انقراض طبقات ضعیف" کے دائرہ نظریات میں افراد کے ساتھ جماعتوں کو بھی داخل کر لیا۔

بیا قوی و حق ضعیف کن پامال
کہ زور منطق امروز زور مندانست

موجودہ تہذیب و تمدّن کی دنیا میں ایک قابل، لائق، خدمت گزار وہ شخص سمجھا جاتا ہے جو خود غرضی اور مطلب پرستی کی اِس عالمگیر فضا میں اپنی قوم یا اپنی پارٹی کے خصوصی مفادات کا بہتر تحفظ کر سکے اُسے دوسری قوموں یا دوسری پارٹیوں کے .... حقوق کا کوئی لحاظ و پاس نہ کرنا چاہئے۔ آج کل ایک کامیاب، بابصیرت، معاملہ فہم سیاستدان اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو بین الاقوامی الجھنوں سے فائدہ اٹھا کر یا اپنے ملک و قوم کا کوئی کام بنا لے یا اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہونچا وے۔

حد سے زیادتی اور حد سے کمی اکثر و بیشتر چیزوں میں مشکلات پیدا ہو جانے کا سبب ہوا کرتی ہے۔ کم چیزیں ملیں گی جو اِس قاعدہ سے مستثنیٰ کی جا سکیں۔ دورِ حاضر کے تمدنی ماحول نے حکومتوں اور قوموں میں غیر معتدل رشک و رقابت کو جنم دیدیا ہے۔ قوموں اور ملکوں سے آگے بڑھ کر یہ وبا ایک ملک اور ایک قوم کے افراد تک پہونچ گئی ہے اس سے انکار نہیں ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن سے پہلے بھی اس سے انسانی دماغ و دل خالی نہ تھے۔ مقصود یہ ہے کہ اِس جذبہ کو اُس کے حدودِ اعتدال سے بڑھانے میں: وسائل راحت و آسائش کی ترقی و

زیادتی کا بڑا ہاتھ ہے۔ انسان کی صنعتی زندگی کا میدان بہت وسیع ہو گیا۔ اُسی کی وسعت نے ہمہ گیر رشک و رقابت کی خطرناک فضا قائم کردی ہے۔ ترقی یافتہ متمدن ملکوں میں خودکشی کی وارداتوں اور گھریلو جھگڑوں اور ناچاقیوں کا سبب یہی رشک و رقابت ہے۔

مشہور فرانسیسی مستشرق "گوستاولوبون"[1] نے مشرقی ممالک کا دورہ کرکے وہاں کے اجتماعی ماحول کا مغربی ممالک کے ماحول سے مقابلہ کیا۔ اُس نے اپنی رائے ان لفظوں میں لکھی ہے۔

"مشرقی اور مغربی ماحول میں بالکل فرق ہے۔ وہاں مغرب کی بے اطمینانیوں اور رقابتوں کی جگہ خاص اطمینان وسکون ہے"

یقیناً ان کا یہ خیال مشرق کے کم از کم ایک صدی پہلے کے ماحول سے متعلق ہے۔ لیکن آج جب کہ مغربی طرزِ تہذیب پوری طرح مشرق پر چھا چکا ہے تو وہی زندگی کی بے اطمینانیاں وہی باہمی رقابتیں مشرق میں نظر آرہی ہیں۔

علم النفس کے امریکی ماہر "ڈیل کارنگی" نے اپنی کتاب "آئینِ زندگی" میں

---

[1] انگریزی کتابوں کے معلومات میں نے ان کے عربی و فارسی ترجموں سے حاصل کئے ہیں لہٰذا مصنفین اور ان کی کتابوں کے اصلی ناموں سے ناواقف ہوں۔ باخبر افراد سے گزارش ہے کہ وہ مجھے "پیامِ عمل" لاہور اور "سرفراز"، لکھنؤ کے توسط سے صحیح الفاظ سے براہِ مہربانی مطلع فرمائیں۔

لکھا ہے۔

"امریکہ میں مہلک اور خطرناک بیماریوں سے تلف ہونے والوں کی تعداد خودکشی کرنے والوں کی تعداد سے کم ہوا کرتی ہے۔ اس کا تنہا سبب باہمی رشک و رقابت ہے۔"

ان باوثوق اقوال سے آپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ ان ممالک میں جو موجودہ تمدن و تہذیب کا گہوارہ ہیں بے چینی اور پریشانی کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ ایک سال ہوا کہ ایک کثیر الاشاعت روزنامہ میں یہ خبر نظر سے گزری۔

"آل ورلڈ محکمہ طبابت کی طرف سے خودکشی کے جو اعداد و شمار بتائے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سال کے اندر تمام دنیا میں بہتر ہزار آدمیوں نے خودکشی کی۔ ضمناً یہ بھی بتایا گیا کہ بہ نسبت مشرقی ملکوں کے مغربی ممالک میں خودکشی کی تعداد ہر سال زیادہ ہوتی ہے۔"

متمدن ملکوں میں خودکشی کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ جان دیدینا ان کے نزدیک ایک کھیل معلوم ہوتا ہے۔ ایک بزرگ نے مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے ایک روزنامہ میں یہ خبر پڑھی۔

"تعطیل کے روز اتفاق سے موسم اچھا نہ تھا۔ سیر و تفریح کا محل نہ تھا اس ذہنی کوفت سے عاجز ہو کر ہالینڈ کے چھ نوجوانوں نے خودکشی کر ڈالی۔"

اس خبر سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ تمدنی ماحول میں ذہنی بے اطمینانی کے

بکثرت اسباب موجود ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص محض موسم کی ناسازی گاری کی بنا پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یقیناً ان نوجوانوں نے موسم کی بے کیفی کو بہانہ بنا کر دوسرے اسباب کے ماتحت خودکشی کی۔

بیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا کے مؤلف لفظ "مرض" کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"اٹلی میں ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۳ء کے آخر تک پانچ سال میں ۵۶۹ عورتوں نے خودکشی کی۔ اس کے بالمقابل فرانس میں جہاں عورتوں کو مکمل آزادی حاصل ہے اسی مدت کے اندر چھ ہزار عورتوں نے اپنی جانیں دیں۔ مغرب کے ان متمدن ملکوں کے مقابل پس افتادہ مشرقی ممالک میں خودکشی کی تعداد صفر کے برابر ہے۔

اس کے بعد یہ بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن اپنے ساتھ کیا پریشانیاں اور ذہنی بے اطمینانیاں لایا ہے۔"

زن و شوہر کے باہمی اختلاف اور اس کے نتیجہ میں طلاق —— یہ بھی موجودہ زمانہ کے لامذہب تہذیب و تمدن کے افسوسناک اثرات ہیں۔ مشہور مصری عالم محمد فرید وجدی نے امریکہ میں طلاق کے عجیب و غریب اعداد و شمار نقل کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "۱۸۶۷ء میں ضلع "اہایو" میں ۲۲۱۹۸ شادیاں ہوئیں اور ۸۳۷ طلاق یعنی ہر چھبیس شادیوں کے مقابل ایک طلاق۔ لیکن ۲۹ سال کے بعد طلاقوں کی تعداد دو گنے سے بھی بڑھ گئی۔ ۱۸۹۷ء میں "کالیفرنیا" میں ہر تین نکاحوں کے مقابل

ایک طلاق آ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں طلاقوں کی تعداد خطرناک طور پر بڑھ رہی ہے۔

ضلع	ماسوشانیت	میں	۲۱ شادیوں کے مقابل	۱	طلاق
〃	روسلان	〃	۱۳ 〃	۱	〃
〃	کونکیت	〃	۱۰ 〃	۱	〃
〃	شیکاگو	〃	۸ 〃	۱	〃

ظاہر ہے کہ علاّمہ محمد فریدی وجدی نے امریکہ میں یہ جو طلاقوں کی تعداد بیان کی ہے اُسے زمانہ گزرا۔ اِس دوران میں وہاں طلاق کا اوسط بہت بڑھ چکا ہے۔ امریکہ کو بالآخر طلاق سے پریشان ہو کر طے کرنا پڑا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو عورتوں کو اپنے شوہروں کے ساتھ اخلاص و محبت پر آمادہ کرے۔ بنانے کو کمیٹی بنا دی جائے لیکن اخلاق و ایمان کا قدم درمیان سے نکال کر کامیابی ناممکن ہے۔

عاشقانہ ناولوں، سینما کے کھیلوں، محبت کی داستانوں سے چھلکتے ہوئے گانوں سے موجودہ زمانہ کے نوجوانوں کی گہری دلچسپی، شراب، سگریٹ اور دوسری نشہ آور چیزوں کا غیر محدود استعمال اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اِس نسل کا انسان شدید پریشانیوں اور دماغی الجھنوں کا شکار ہے۔ وہ ان ذہنی بے چینیوں سے چھٹکارے کے لئے طرح طرح کی سبیلیں نکالتا ہے۔

کسی مشہور انشا پرداز نے بیڑی اور سگریٹ کی فیکٹری کے متعلق

لکھا تھا" وہ جگہ جس کی آمدنی لوگوں کے غم و فکر کی زیادتی سے بڑھتی اور ان کی مسرت و فارغ البالی سے گھٹتی ہے"۔

اس حقیقت کو کسی طرح نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ موجودہ طرز تمدّن میں انسان کی پریشانیاں اور بے اطمینانیاں روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہیں علم و صنعت کی غیر معمولی ترقیوں کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی و دماغی راحت و آسائش کے دروازے برابر بند ہوتے چلے جارہے ہیں ان ذہنی بے چینیوں کے مقابلہ کے لئے یورپ میں بکثرت کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ جنہیں ہر طبقہ کے لوگ بڑے شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ عام مقبولیت خود ہمارے دعویٰ کی بہت صاف اور مضبوط دلیل ہے۔ ان بے اطمینانیوں کے اصلی اسباب اجمالاً معلوم ہو گئے۔ آئندہ انہی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

متمدّن اور غیر متمدّن کا فرق

میرا خیال ہے کہ اگر ہم تھوڑی سی جرأت سے کام لیں، اس زمانہ میں جو واقعات پیش آتے ہیں انہیں نظر میں رکھیں، حسن ظن اور خوش باوری کا قدم درمیان سے نکالدیں تو بآسانی اقرار کریں گے کہ جو کام اُس وقت وحشت و بربریت کے دور میں انسان کے ہاتھوں رونما ہوتے تھے بعینہ وہی اس تہذیب و تمدّن کے زمانہ میں بھی انجام پاتے ہیں۔ ہاں فرق یہ ہے کہ چونکہ اس وقت علوم

فنون نے ترقی نہیں کی تھی اس لئے ان کاموں کا کوئی خوشنما اور دلکش نام نہیں تراشا جا سکا تھا۔ صاف اور سادہ لفظوں سے یاد کرتے تھے۔ ظلم و تعدی، خود خواہی و خود غرضی، مکاری و ابلہ فریبی، خود سری و خود کشی، بد دیانتی و غارت گری، آج معنی اپنی جگہ پر ہیں مگر ہر شے کی ترقی کے ساتھ لفظ سازی کا ملکہ بھی ترقی کر گیا ہے۔ اب اس زمانہ میں تعبیرات بدل گئے ہیں۔ اب یوں کہا جاتا ہے — قانون تکامل، عدالت اجتماعی، دفاع از حقوق زندگی، تقاضائے ماحول، حق مشروع، جمہوریت اور ڈیموکریسی۔

گزشتہ زمانہ کے لوگوں کی صرف یہ خطا تھی کہ انہیں اپنی کارگزاریوں کا کوئی خوبصورت نام رکھنا نہیں آتا تھا۔ ہمارا خاص ہنر یہ ہے کہ ہمیں الفاظ تراشی پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یقیناً اس تلخ حقیقت کا ماننا بہت مشکل ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ مجبوراً ماننا پڑے گی۔

متمدن اور غیر متمدن کے درمیان ہم نے جو فرق بیان کیا ہے اُسے بسہولت نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ ممکن ہے بعض لوگ موجودہ تہذیب و تمدن کی اس کو توہین قرار دیں، بدظنی اور بے دینی پر محمول کریں۔ کسی یقینی نتیجہ تک پہونچنے کے لئے گزشتہ انسانی تاریخ کے اوراق پلٹنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص زمانہ وحشت و جاہلیت کی انسانی کارگزاریوں کو پیشِ نظر رکھے تو اُسے موجودہ دور

تہذیب و تمدن میں ان کا ایک ایک نمونہ دستیاب ہو جائے گا۔ یقیناً عملی زندگی میں ہمارے اور گزشتہ نسلوں کے درمیان کوئی تفاوت نہیں ہے۔ صنعتی ترقیوں کی وجہ سے ہماری بے اعتدالی کے تباہ کن نتائج کا دائرہ نسبتہً کشادہ تر ہو گیا ہے۔ سائنس کے ظاہری طمطراق سے چوندھیا کر انسان اس کی تباہ کاریوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

وہ انسان کہ جس نے علم و صنعت کے میدان میں اتنی ترقی کی کہ آج فضائی کروں تک پہونچنے کے خواب دیکھ رہا ہے، وہ انسان کہ جس نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ سارا عالم اور اُس کی چھپی ہوئی قوتیں میرے زیر قدم ہیں۔ وہ انسان کہ جو گزشتہ نسلوں کی وحشت و بربریت کا مذاق اڑاتا ہے، وہ انسان کہ جو چند لمحوں میں زمین کے گرد لاکھوں میل کا چکر لگا لیتا ہے، وہ انسان جو مشرق میں بیٹھ کر مغرب کی آوازیں اور شمال میں رہ کر جنوب کی صدائیں چشم زدن میں سن لیتا ہے۔ آج اپنی معاشرتی زندگی میں اُن وحشی اور غیر متمدن قوموں کی پیروی کر رہا ہے۔

میرے خیال میں آج کے متمدن اور کل کے غیر متمدن انسان دو لالچی بھوکوں کے مانند ہیں۔ ان میں سے ایک اَن پڑھ اجڈ دیہاتی اور دوسرا پڑھا لکھا مہذب شہری ہے۔ دونوں بھوکے ایک وسیع رنگا رنگ مزیدار غذاؤں سے سجے ہوئے دسترخوان پر بیٹھے

کھانے میں مشغول ہیں۔ اگر اس دیہاتی سے پوچھا جائے کہ کیوں اس بیتابی سے کھا رہے ہو تو اُس کے پاس سوائے اس کے کوئی جواب نہیں ہے کہ بھوکا ہوں جب تک دم میں دم ہے کھاتا رہوں گا اس کے بالمقابل جب وہ تعلیم یافتہ شہری اِس قاب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو کہتا ہے کہ اہا اہا اہا .... وٹامنوں سے چھلک رہی ہے، وٹامن (اے) وٹامن سی، وٹامن ڈی، اُس پلیٹ کی طرف رُخ کرتا ہے کہتا ہے اے سبحان اللہ کیلشیم ہی کیلشیم ہے تیسری ڈش کو اٹھاتا ہے واہ واہ اجزاء حیات سے بھری ہوئی ہے۔ فاسفورس، لوہا طرح طرح کی مفید ایسڈ۔ دیکھا آپ نے مطلب دونوں کا ایک ہے لیکن لفظوں میں زمین آسمان کا فرق۔

کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم نے بالکل ترقی نہیں کی، یقیناً زندگی کے سیکڑوں شعبوں میں ہم آگے بڑھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ طے ہے کہ ہماری ترقیاں ہمیں ذہنی سکون و اطمینان نہیں بخش سکیں۔ ہماری معاشرتی زندگی کی گتھیاں الجھی کی الجھی رہیں۔ اپنا خیال یہی ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم ایمان واخلاق کو اپنے پس پشت ڈال کر آگے بڑھے۔ اس میدان میں ہم بجائے آگے جانے کے پیچھے ہٹتے رہے۔ موجودہ تہذیب وتمدن سے متاثر ہو کر مخصوص اسباب کی بنا پر عوام

نہ صرف مذہب سے بیگانہ بلکہ بیزار ہو گئے۔

منافع کا ٹکراؤ

اگلے زمانہ میں معدن انسان کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ وہ ان کی موجودگی ہی سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کو کائنات کی تسخیر کا راستہ نہ ہی معلوم نہیں تھا۔ اسی بنا پر آج جسے سرمایہ کہا جاتا ہے وہ اُس وقت بہت کم موجود تھا۔ اُس زمانہ میں ایک جگہ کے لوگ دوسرے مقامات کے لوگوں سے بالکل بے خبر تھے۔ باخبر ہونے کی صورت میں بھی ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے خصوصی فوائد و منافع کے درمیان تصادم بھی بہت کم ہوتا تھا۔ انہیں جماعتی قوانین کی احتیاج بھی ہمارے بہ نسبت کم تھی اسی طرح اجرائے قوانین کی پشت پناہی کے لئے اُن کو ایمان و اخلاق کی ضرورت بھی بہت زیادہ نہ تھی۔ اُس زمانہ کے برعکس آج علم و فن کے ہاتھوں نے زمین کا سینہ چاک کر کے اُس کے بیش بہا خزانوں کا انکشاف کر لیا ہے۔ اِن معدنوں کے قبضہ نے انسان کے دامنِ حرص و آز کو عظیم سرمایہ سے بھر دیا ہے۔ اکثر قوائے کائنات کو مسخر کر کے اپنے اپنے کاموں میں لگا دیا گیا ہے۔ زندگی ایک نیا بھیس بدل کر سامنے آ گئی ہے۔ سرمایہ کی فراوانی اور وسائلِ نقل و ربط کی آسانی نے باہمی تصادم کے

امکانات بڑھادئے۔ انہی امکانات پہ نظر کرتے ہوئے اجتماعی قوانین کی ضرورت اور اُن کے صحیح طور پر نفاذ و اجرا کے لیے ایمان وَاخلاق کی احتیاج شدت سے آج محسوس ہوتی ہے۔

ایک وقت میں زمین کے بعض حصّے ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے۔ وسائل نقل و ارتباط کم اور سست رفتار تھے۔ اسی لئے تصادم بھی صرف ہمسایہ سلطنتوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس کے برخلاف آج چھوٹی سے چھوٹی قوم کو دور ترین زمین کے حصّوں میں اپنے منافع زندگی نظر آتے ہیں۔ وہ دو سلطنتیں جو دنیا کے دو سروں پر آباد ہیں اکثر زمین کے کسی تیسرے نقطہ پر اپنے اپنے خصوصی فوائد کے پیشِ نظر باہم دست وگریبان دکھائی دیتی ہیں۔

یہی موجودہ حالات وہ ہیں جن میں عدالت اجتماعی کے قوانین کے نفاذ و اجرا کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان قوانین کی ضرورت محدود طور پر ہر زمانہ میں محسوس ہوئی۔ لیکن آج کل کے تہذیب و تمدن کی وجہ سے دنیا کے حالات نے جو نئی صورت اختیار کرلی ہے اُن میں عدالت اجتماعی کی ہمہ گیر رعایت کی بیشتر احتیاج ہے۔

اجتماعی قوانین کا نفاذ و اجرا

تمام عالمِ انسانیّت کے سود و بہبود کو پیش نظر رکھ کر جو شخص یا

جماعت قانون بنائے اُس کے متعلق ایک بنیادی بات کہی گئی ہے۔ "ژاں ژاک روسو" نے اپنی کتاب "قرار داد ہائے اجتماعی" میں لکھا ہے:-

"تمام قوموں کے لئے مفید بہترین قوانین تشکیل دینے کے واسطے ایک عقل کل کی ضرورت ہے جو تمام انسانی خواہشوں کا مطالعہ کرے لیکن خود اُسے کوئی شخصی خواہش نہ ہو۔ انسانی فطرت کو وہ کاملاً پہچانتا ہو مگر خود اُس سے کوئی رابطہ نہ رکھے اُس کے فوائد ہم سے وابستہ نہ ہوں۔ بلکہ وہ ہر قسم کے فائدے اٹھانے میں ہماری مدد کرے۔"

"روسو" نے قانون سازی کے لئے جس بے لوث عقل کامل شخصیت کی نشاندہی کی ہے اُس کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص از خود سمجھ رہا ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان قوانین کے نفاذ و اجرا کا بار صرف ایمان و اخلاق کے کاندھوں پر آ سکتا ہے۔ فی الحال اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کرنا ہے۔ اِس سے قطع نظر کرتے ہوئے اِس وقت قانون سازی کے موجودہ طرز اور نفاذ قانون کی بابت گفتگو کرنا ہے ایک بنیادی ہمہ گیر مسئلہ کے بارے میں سوچنا ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ قانون سازی کا بنیادی مقصد عدالت اجتماعی کا تحفظ اور مفاد کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ اختلافات کا سدِّ باب ہے۔ افسوس کہ قانون سازی کا موجودہ طریقہ نہ صرف یہ کہ اس اساسی مقصد کو

وجود میں نہیں لاتا بلکہ وہ باہمی اختلافات کی آگ کو خود ہوا دیتا اور بہت سے انسانی حقوق کے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری پھیرتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ آج کل قانون سازی کا حق اکثریت کو دیدیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اکثریت کے منافع کا تحفظ کرکے یا اقلیت کی خواہشوں کو قربان کردیا گیا یا کم از کم اُن کی طرف سے بے اعتنائی برتی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ قانون سازی ایمان اور اخلاق سے آنکھیں بند کرکے کی گئی ہے۔ اس کے بعد بیچاری اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ دار کون رہ جاتا ہے؟ ان کی قسمتوں کا فیصلہ ہمیشہ اکثریت کے ہاتھ میں ہے یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اقلیت ہمیشہ چند گنتی کے افراد ہی کا نام نہیں ہوتا بلکہ کبھی اُس کی قابل لحاظ تعداد ہوتی ہے۔ ایسا بھی نظر آتا ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے درمیان صرف دس پانچ آدمیوں کا فرق رہ جاتا ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اتنے معمولی تفاوت کی صورت میں دائمی طور پر زندگی میں کیسا خلفشار رہے گا۔ ہر وقت دونوں میں جوتی پیزار، ہر روز فتنہ و ہنگامہ۔

تمام دنیا کی صورت حال ہمارے سامنے ہے، کسی ملک و قوم کا نمائندہ دوسرے اقوام و ملل کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے خصوصی و جزئی مفاد کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ کسی پارٹی کا سربراہ اپنی جماعت کے منافع کو خطرے میں دیکھ کر حق و عدالت کی خاطر چین سے نہیں بیٹھ سکتا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ دوسری پارٹیوں کا لحاظ کرکے اپنی جماعت

کے درمیان خود کو غدّار اور ناقابلِ اعتماد قرار دے دنیا کی کوئی اکثریت آمادہ نہیں ہے کہ مجموعی عدالت کی رعایت کرتے ہوئے اپنے مخصوص منافع سے چشم پوشی کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر پچھلے سارے غیر متمدّن زمانہ میں دولتمند طاقت ور افراد اپنے مقاصد و نظریات کمزور اور بے سہارہ اشخاص کے اوپر زبردستی لادا کرتے تھے تو آج تہذیب و تمدن کے درخشاں دور میں وہی برتاؤ دولت و طاقت کی پجاری جماعتیں نادار، بے وسائل جماعتوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ پہلے اُسے ظلم و قانون شکنی سمجھا جاتا تھا لیکن آج روح قانون اور سرچشمۂ قانون سازی!!

قانون سازی کی اس مشکل سے سخت تر دشواری ان قوانین کے اجراء میں پیش آتی ہے۔ آج کل پوری قوم کا نمائندہ بنا کر اقتدار چند آدمیوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ اقتدار دیدینا آسان ہے لیکن اُسے واپس لینا بہت مشکل ہے۔ انصاف سے بتلایئے کہ اگر یہ صاحبانِ اقتدار اپنے یا اپنے ہم خیال دوستوں کے خصوصی فوائد کی خاطر قانون میں تغیر و تبدل کر دیں یا اسے دیانتداری سے نافذ نہ کریں تو کون اُن سے بازپرس کر کے اپنی ذات اور عزت، آبرو کو نشانۂ ظلم بنا سکتا ہے؟

اگر کوئی با اقتدار شخص یا طاقت ور اکثریت ظلم و تعدی، تمرد و سرکشی پہ کمر باندھ لے، دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے پر تل جائے تو کس میں

سکتا ہے کہ اُسے قانون کا پابند بنائے؟ کس وسیلہ سے عوام اور اقلیت کے حقوق کے سامنے اُس کا سر جھکایا جائے؟ آخر با اقتدار اور طاقت ور ممالک کے لئے اجراء قوانین کا ذمہ دار کون ہے؟ ممکن ہے بعض اوقات اُن کے اقتدار سے بالاتر کوئی اقتدار موجود ہو لیکن اکثر اوقات اُن کے قانون شکن اقدامات کی مضرتوں سے زیادہ اُنہیں قانون کا پابند بنانا اجتماعی و اقتصادی نقصانات کا سبب بن جاتا ہے

موجودہ دنیا میں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ یہ تمام ملکی اور بین الاقوامی قوانین صرف کمزور افراد اور بے سہارہ جماعتوں کے بارے میں قابل اجرا ہیں۔ اگر وہ قانون کی تھوڑی سی بھی خلاف ورزی کریں تو اُن کو طاقت وقوت سے دبا کر احترام قانون پر مجبور کیا جا سکتا ہے، باوسائل افراد اور گروہ قانون کی گرفت سے بالکل آزاد ہیں۔

واقعا سوچنے کی بات ہے کہ اگر دنیا کی بڑی سلطنتوں کے درمیان اختلاف ورقابت نہ باقی رہے، وہ شیر و شکر کی طرح گھل مل جائیں متحد و متفق ہو کر ساری دنیا کے منافع کو حصہ رسدی آپس میں تقسیم کریں تو دنیا کا نقشہ بالکل بدل جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور کمزور و ناتوان قوموں کا نام و نشان تک روئے زمین سے محو ہو جائے گا۔

آج کل آپ کو یہ منظر بہت نظر آئے گا کہ بعض کمزور اشخاص طاقتور افراد کے مقابل اور بعض چھوٹی حکومتیں بڑی سلطنتوں کے سامنے

ڈٹی ہوئی ہیں، نہایت سخت و درشت لب ولہجہ میں اپنے حقوق کا پرزور مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ مختصر بے ذرائع و وسائل نوآبادیات برسر اقتدار سلطنتوں کی غلامی و محکومیت کے پھندے سے اپنے گلے برابر چھڑاتے چلے جا رہے ہیں، ان حیرت انگیز مناظر کو دیکھ کر غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہئے، یہ سب اس لئے نہیں ہو رہا ہے کہ قانون پروری اور حق شناسی کی روح نے اقوام و دول کے دل و دماغ پر تسلّط پالیا ہے اس کا سبب صرف طاقتور عناصر کی باہمی مخالفت و رقابت ہے جب یہ عناصر ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے تو کمزور آواز دل کی کوئی شنوائی نہیں ہو گی۔

نہ سلجھنے والی گتھیاں

ہم مکرر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ علم وصنعت کی ترقی نے زندگی کی بہت سی مشکلیں حل کر دی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ بہت سے موجودہ مشکلات اسی ترقی کے پیدا کردہ ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ علوم وفنون اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود ان مشکلات کا دروازہ کیوں نہ بند کر سکے؟ انہوں نے تہذیب تمدن کے صرف خوشگوار پہلوؤں کو پھلنے پھولنے کی اجازت کیوں نہ دی؟ دنیا کو ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ موجودہ علوم

وفنون ان گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز ہیں۔ اُن کے پاس اِن مشکلات کے حل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آج کل کے علوم وفنون کے ذمہ صرف دو کام ہیں، موجودات عالم کے تعلقات و روابط کا انکشاف کرنا اور کائنات کی پوشیدہ طاقتوں پر قابو پانا۔ یہ علوم ہمیں کائنات سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ نہیں بتلاتے ہیں حالانکہ زندگی کی اکثر دشواریاں اسی غلط طرز استفادہ اور بے جا طریقۂ استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ یقیناً موجودہ طرز تمدن کی پیدا کردہ خرابیوں کی کسی حد تک اصلاح علوم اجتماعی کر سکتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ان اصلاحات کو روبکار لانے کا بار اٹھانے والا کوئی موجود نہیں ہے۔

کمیونسٹوں کا خیال ہے کہ ہر چیز کی گود میں اس کی ضد پرورش پاتی ہے، ہر شے اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودتی ہے۔ اُنہوں نے اِس اصول کے دائرہ کو نہایت ہمہ گیر قرار دیا ہے۔ بلا شبہ اُن کے دوسرے اصولوں کی طرح اس اصول کا کوئی علمی و فلسفی وزن نہیں ہے، اُس کی ہمہ گیری اور عمومیت بھی ہم تسلیم نہیں کرتے، تاہم انہیں اس کی مثال میں اسی موجودہ طرز تہذیب کو پیش کرنا چاہیئے۔ یہ نمایاں بات ہے کہ اس میں اصلاحی عناصر کے ساتھ تخریبی جراثیم کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انسان جس راستہ کو پسند کر کے چلا ہے

وہ بہت سی بند گلیوں پر پہونچ کر ختم ہوگیا ہے، اُس کے سامنے منزل تک پہونچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، حیرت و سرگشتگی نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، زندگی کے ہر موڑ پر طرح طرح کے مشکلات سے وہ دوچار ہے۔

۱۔ قانون سازی کے اسلوب اور اجراء قانون کے طرز میں جن دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اُن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۲۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے جو مشکلات پیدا ہوتے ہیں انہیں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وسائل پیداوار کی ترقی متمدن سلطنتوں کو صنعتی مرکز بنا دیتی ہے۔ دوسرے ملکوں پر ان سلطنتوں کی نظر دو وجہوں سے رہتی ہے، اوّل یہ کہ اُنہیں اپنے صنعتی کارخانوں کے لئے خام مادے کی ضرورت ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ تیار شدہ سامان کی اپنے ملک میں پوری کھپت نہ ہو سکنے کی بنا پر اُس کی فروخت کے لئے دوسرے ملک کے بازاروں پر قبضہ کی احتیاج ہے۔ ان دونو مقاصد کو وہی غیر ترقی یافتہ ممالک پورا کر سکتے ہیں جو علم و صنعت کی دوڑ میں دوسرے ملکوں سے پیچھے ہیں۔ جو اپنے یہاں کے قدرتی خام مادوں سے صنعتی سامان تیار کر کے اپنے ضروریات زندگی کی خود کفالت نہیں کر سکتے۔

انہی دو باتوں کی بنیاد پر استعمار اور نوآبادیاتی ذہنیت کا قلعہ تیار ہوتا ہے۔ انہی کی وجہ سے طاقتور حکومتوں کے درمیان

مستعمرہ بازی کے میدان میں خطرناک دوڑ شروع ہوجاتی ہے۔ ہر ایک کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ اپنی صنعتی طاقت بڑھا کر دوسروں پر سبقت لے جائے۔ زیادہ سے زیادہ ملکوں کو نوآبادیات کے طور پر یا کسی اور نام سے اپنے زیر اقتدار لائے بالاخر ان ترقی یافتہ بڑی طاقتوں کے درمیان دائمی کشمکش اور ناقابلِ اصلاح نزاع شروع ہوجاتی ہے جس کی جولانگاہ بدقسمتی سے کمزور ممالک بنتے ہیں۔ دوسری طرف پس افتادہ ممالک اقتصادی آزادی کے ساتھ اپنی سیاسی حریت کو بھی کھو دیتے ہیں۔ چونکہ حریت خواہی اور استقلال طلبی انسانی فطرت کا جز ہی نہیں بلکہ اُس کے حقوق و منافع کی پاسبان بھی ہے لہذا کمزور ممالک دوسروں کے شکنجۂ محکومیت سے نکلنے کے لئے برابر ہاتھ پیر مارتے رہتے ہیں نتیجتہً اُن کے اور با اقتدار طاقتوں کے درمیان ہمیشہ رسہ کشی ہوتی رہتی ہے جس کا انجام ہر شخص کو معلوم ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ کسی زیر تسلّط ملک کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صاحب اقتدار حکومت میں خام چیزوں کی درآمد پر قابل لحاظ اثر پڑ جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہاں کی تیار شدہ اشیاء کی برآمد میں بھی خاصی کمی آجاتی ہے۔ یہ دونوں باتیں فوراً کارخانوں اور بازاروں کی حالت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ فیکٹریوں میں کام کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور بازاروں میں چیزوں کا بھاؤ چڑھ

جاتا ہے۔ مزدوروں کی بہت بڑی تعداد بیکار ہو کر پریشان حال بن جاتی ہے۔ ایسے سخت اقتصادی و سیاسی مشکلات پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں حل کرنا حکومت کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

اسی بنا پر حیرت و تعجب کا کوئی محل نہیں ہے کہ فرانس جیسے حریت و آزادی کی پرورش گاہ، جدید تہذیب و تمدن کا بانی مبانی علم و صنعت کا سرچشمہ کہا جاتا ہے اپنے فوائد و منافع کے تحفظ کی خاطر اہلِ جزائر کے ساتھ ایسی شرمناک بدسلوکیاں اور عبرتناک زیادتیاں کرتا ہے۔ جن کی مثال اس وحشت و بربریت کے دور میں بھی نہیں ملتی۔ یہ ناقابلِ برداشت سے ظلم و جور انہی اقتصادی کشمکشوں کا نتیجہ ہے جو سارے قوانین اجتماعی اور حقوق انسانی کو نگل گئیں۔

۳۔ آج کل کے تہذیب و تمدن کی برکت سے صنعت و تجارت نے جو صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں اوسط درجہ کے کاروباری طبقے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے ہیں۔ اس وقت دو گروہ ہمارے سامنے ہیں جن کی مالی حالت میں غیر معمولی تفاوت ہے، ایک مزدوروں کی جماعت جو اعداد و شمار میں دوسروں پر فوقیت رکھتی ہے، دوسری سرمایہ داروں کی جماعت جسے اقتصادی و مالی برتری کی وجہ سے سیاسی تفوق بھی حاصل ہے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان بھی مستقل جھگڑے ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں۔

مزدور سرمایہ داروں کو اپنے واجبی حقوق کا غاصب سمجھتے ہیں،

اُنہیں یقین ہے کہ ہماری محنت و مشقت کا صحیح عوض ہم کو نہیں ملتا اُدھر سرمایہ داروں کا خیال ہے کہ مزدور حرص و طمع میں مبتلا ہیں اپنے واجبی حق سے زیادہ کے طلب گار ہیں۔ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کی طرف احتیاج کے باوجود برابر اپنے مقاصد میں کامیابی اور اپنے خصوصی منافع کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں اس کش مکش میں اگر مزدور طبقہ کامیاب ہو گیا تو اشتراکی طرز پر حکومت قائم ہو جانا اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس کے بالمقابل دولتمندوں کے غلبہ کی شکل میں غیر معتدل سرمایہ داری کا برسر اقتدار آ جانا ناگزیر ہے۔ دونوں صورتیں انسانیت کے امن و اطمینان، حریت و آزادی خوش حالی و فارغ البالی کے واسطے خطرناک ہیں۔ پھر مزدور اور سرمایہ دار کا یہ تصادم اور ٹکراؤ جلد ختم ہونے والا نہیں ہے بلکہ برابر اُس کا دائرہ کشادہ سے کشادہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

۴۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ امر محتاج وضاحت نہیں ہے کہ صنعت و تجارت کی ترقی کے ساتھ افراد و اشخاص کے درمیان تعلقات و ارتباطات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ صنعتی و تجارتی مقاصد میں کامیابی کے لئے متعلقہ افراد میں خلوص و ہم آہنگی کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ خلوص و یک جہتی افراد کے باہمی اعتماد و اطمینان سے پیدا ہوتی ہے۔ عمومی اعتماد و اطمینان اخلاق و ایمان کی بدولت حاصل ہوتا ہے بدقسمتی سے مخصوص اسباب کی بنا پر

جنہیں بعد میں بیان کیا جائے گا۔ موجودہ تہذیب وتمدن نے ایمان واخلاق کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا ہے۔ آج کل اطمینان نے اپنی جگہ بے اطمینانی کو دیدی ہے جس کی وجہ سے تمام اقوام و دول کے قلوب کو بد بینی و بے اعتمادی کی آگ نے جھلسا دیا ہے۔

ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ دنیا کی ہر شے میں، دواؤں میں، کھانے پینے کی چیزوں میں، صنعتی وتجارتی سامانوں میں، دستاویزوں اور نوٹوں میں، سکوں اور کارخانوں کے ٹریڈ مارکوں میں ہر قسم کی بے ایمانی اور بد دیانتی ہوا کرتی ہے۔ یہ خیانتیں اس بے اعتمادی کی آگ کو ہوا دے کر اور بھڑکاتی ہیں۔ اب ایسی خطرناک زہریلی فضا قائم ہو گئی ہے کہ اللہ کی پناہ .... ہر شخص خیال کرتا ہے کہ اُس کا شریک کار اُس کو فریب دینا چاہتا ہے، اس کا پڑوسی چور ہے، اس کی دوکان پر کام کرنے والے بد دیانت ہیں، فلاں رئیس مجھے اپنا آلہ کار بنانا چاہتا ہے، فلاں لیڈر اغیار سے رابطہ رکھتا ہے، وہ غدار ہے قوم کے مفاد کو اپنے شخصی مقاصد پر قربان کرنا چاہتا ہے۔ بات یہاں تک کھنچ کر پہنچ گئی ہے کہ انسان لاکھوں آدمیوں کے بیچ میں رہ کر بھی اپنے کو تنہا سمجھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ مجھے اپنا کام خود ہی انجام دینا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ ایک طرف حسن ظن، خلوص واعتماد، ہم آہنگی ویک جہتی

کی ضرورت روز بروز بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف موجودہ طرز تمدن میں یہ باتیں برابر نایاب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ وہ اجتماعی الجھن ہے جو ہمیشہ ایمان و اخلاق کی ابتری سے رونما ہوتی ہے طرح طرح کی ان گتھیوں کی وجہ سے زندگی کے مختلف مسائل میں عجیب وغریب قسم کے تضاد نظر آتے ہیں۔ بہت سے اجتماعی تضاد انہی اجتماعی مشکلات کے شکم سے پیدا ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کو جب ان دشواریوں کے حل کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ کبھی اِس رخ پر دوڑ جاتا ہے اور کبھی اُس رخ پر۔ بے محل نہیں معلوم ہوتا کہ اجمالی طور سے ان تضادوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے جو متذکرہ قانونی، اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی الجھنوں کا نتیجہ ہیں۔

(۱) بلا استثنا، تمام اقوام و دول صلح و سلامتی کے طرفدار اور امن و امان کے خواہاں ہیں۔ جنگ کے تباہ کن منحوس نتائج سے سب بھاگتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بلا استثنا، تمام قومیں اپنی جنگی طاقت بڑھانے اور اسلحہ سازی کے میدان میں دوسروں پر سبقت لیجانے میں برابر کوشاں رہتی ہیں۔ اپنی قدرت و توانائی کے حدود میں کوئی بھی کوتاہی نہیں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آخری دونوں باتیں جنگ اور نقض امن کی طرف ایک زبردست اقدام کے محرک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ب - تمام متمدن قومیں غلام فروشی اور اس کے مظاہرات کو ناجائز، قابلِ مذمت قرار دیتی ہیں، لیکن استعمار کو عملی طور پر یہی قومیں جائز سمجھتی ہیں، حالانکہ افراد کو غلام بنانے سے بدرجہا زیادہ مذموم قوموں اور ملکوں کا غلام بنانا ہے - پھر لطف یہ کہ بعض اوقات جب کوئی زیرِ تسلط ملک قابو سے باہر ہو جاتا ہے تو با اقتدار قوم کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ ہم اُسے آزادی و خود مختاری دیتے ہیں گویا آزادی و خود مختاری اُن کی مخصوص ملکیت ہے کہ جسے چاہیں مرحمت فرمادیں۔

ج - متمدن دنیا ایک طرف طرح طرح کی بیماریوں کا مقابلہ کرتی ہے اسپتال قائم کئے جاتے ہیں۔ آبادیوں کی صفائی کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مختلف وسائل صحت و تندرستی کو ترقی و وسعت دی جاتی ہے۔ دوسری طرف ناجائز جنسی اختلاط اور شراب نوشی کو نہ صرف قانوناً جائز بلکہ جدید تہذیب و تمدن کا امتیازی نشان قرار دیا جاتا ہے مسلم حقیقت ہے کہ یہ دونوں چیزیں گوناگون بیماریوں کا زبردست سبب ہیں۔

د - ایک طرف اقوام و ملل میں متانت و سنجیدگی، معقولیت و معاملہ فہمی، حسنِ ظن و نیک نیتی پیدا کرنے کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف وعدہ خلافی، عہد شکنی، تلون مزاجی اور ابن الوقتی کے مظاہرات کر کے بدبینی و بدظنی، خود غرضی و مطلب پرستی

کے وسائل فراہم کئے جاتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

قافلہ راستہ میں

گزشتہ مندرجات کی روشنی میں ممکن ہے کوئی شخص خیال کرے کہ ہم علم و صنعت کی موجودہ ترقیوں کو انسانیت کی بدبختی کا سبب جانتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمہ گیر راحت و آسائش اور سکون و اطمینان کی منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس وقت جس راستہ پر گامزن ہے اُسے چھوڑ دے، وہ جتنا آگے بڑھا ہے اتنا ہی پیچھے پلٹ جائے۔ وہ بجلی استعمال کرنے کے بجائے شمع اور کڑوے تیل کا دیا جلائے، بجائے موٹر اور ہوائی جہاز پر بیٹھنے کے خچر اور گدھے پر سوار ہو۔ کاغذ اور چھاپے خانہ کو چھوڑ کر اپنی کتابیں زعفران سے پوستِ آہو پر لکھے، اعلیٰ درجہ کے نفیس کپڑے کی جگہ بالوں اور پتوں سے اپنی تن پوشی کرے۔

یقیناً یہ ہمارا مقصد نہ تھا، ہم موجودہ تہذیب و تمدن کے نقصان رساں پہلوؤں کو اجاگر کرکے اُن سے چھٹکارے کا راستہ دکھانا چاہتے تھے۔ ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان حیرت انگیز ترقیوں کے خوشگوار نتائج سے انسان کیونکر فائدہ اٹھا سکتا اور اُن کے نقصان رساں، تباہ کن پہلوؤں سے محفوظ رہ سکتا ہے، وہ کونسا وسیلہ ہے

جو پھولوں کو خاروں سے اور شہد کو زہر سے الگ کر دے۔
مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے تہذیب و تمدن کی انہی کمزوریوں اور خرابیوں کے راستہ سے اُس کی اُن خوبیوں تک پہونچا جا سکتا ہے جن میں برائی کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔ اگر ہم باہوش، سلیم الفہم اور دانشمند ہوں تو انہی فکری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بلاشبہ تمدنی ترقیوں کے یہی بدترین پہلو، یہی تباہ کن نتائج ایک بلند خوشگوار، تر و تازہ زندگی تک پہونچا سکتے ہیں۔ ایسی زندگی جس میں راحت و آسائش، خوش بختی و کشائش کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ ایسی زندگی جس کی گود میں جنّت کی بہاریں اور بہشت کی خوشحالیاں مسکرا رہی ہوں، ایسی زندگی جس میں بے اعتمادی کی جگہ اعتماد باہمی، بدبینی و بدظنی کی جگہ خوش باطنی اور حسن ظن افتراق و اختلاف کے بجائے اتحاد و اتفاق کی عام فضا ہو۔ یقیناً یہی بدبختیاں ہمیں خوش قسمتی کا راستہ دکھا کر اسے ہمارے لئے صاف اور ہموار کریں گی۔ انسان جب گوناگوں امراض کی اذیتوں سے پریشان ہوتا تو ان بیماریوں کے اصلی اسباب کی بیخ کنی پر تل جاتا ہے۔ یہی امراض کے شدائد اُسے آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اُن کے مقابلہ کے لئے اپنے جسم کو تقویت پہونچائے، بدن کی تقویت اُسے ہر طرح کی بیماریوں کے حملہ سے محفوظ رکھے گی۔
واقعاً ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ یہ موجودہ اجتماعی، اخلاقی،

اقتصادی، سیاسی دشواریاں ہمہ گیر بنیادی اصلاحات کا پیش خیمہ ہیں۔ وہ اصلاحات جن کے بعد جامعۂ بشریت بالکل ایک نئی صورت اختیار کرے گا، وہ اصلاحات جو "تنازع للبقا" کے میدان کارزار کو تعاون للبقا کا گلشن نوبہار بنادیں گے۔ وہ اصلاحات جو دلوں سے نفرت وعداوت، حسد ورقابت کے جذبوں کو نکال کر انہیں ہمدردی و بہی خواہی اور نیک دلی و برادری کے احساسات سے بھر دیں گے۔

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون (آیت ۴۱ - س روم)

"لوگوں کی بداعمالیوں سے پیدا شدہ مفاسد نے خشکیوں اور دریاؤں کو بھر دیا ہے تاکہ وہ اپنے بُرے اعمال کی تلخیاں محسوس کریں اور راہِ حق کی طرف پلٹ آئیں۔"

مذہب کی حکومت

سابق میں بتایا گیا کہ اگر قانون سازی کے سلسلہ میں پیش آنے والے مشکلات کو حل بھی کر لیا جائے تو نفاذِ قانون مرحلہ میں ایسی زبردست دشواریوں کا سامنا ہے جن سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے فرض کیجئے کہ ملک کے تمام باشندے بلا استثنا کسی عام الکشن میں شرکت کریں، دوران انتخابات میں کسی فرد یا جماعت

کی طرف سے عوام کو اپنا موافق بنانے کے سلسلہ میں بواسطہ یا بلا واسطہ کوئی کوشش نہ ہو، رائے دہندگان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے، وہ باتفاق رائے کچھ لوگوں کو نمائندگی کے لیئے چن لیں جن کے معلومات کا دائرہ نہایت وسیع ہو، وہ انسان کے جسمانی و روحانی تمام خصوصیات سے افراد ملک کے باہمی روابط اور اُن کے اجتماعی ضروریات سے، ماحول کے تقاضے اور بین الاقوامی سیاست کے مزاج سے کامل واقفیت رکھتے ہوں۔ ان تمام باتوں کے بعد یہ بھی فرض کر لیجئے کہ یہ سب نمائندے قانون سازی کے موقع پر اپنے کو محبت و عداوت، امید و آرزو، خودغرضی و مطلب پرستی کے شکنجوں سے چھڑانے میں کامیاب ہوگئے ہوں، یہ ایسے ہر جذبہ سے بالاتر ہوں جو انسان کو عدل و انصاف، توازن و اعتدال کے راستہ سے ہٹا سکتا ہے۔ یہ فرشتہ خصلت نمائندے باتفاق آراء پوری قوم کے لیئے ایک قانون مرتب کریں جو کل انسانی ضروریات حاوی اور اجتماعی عدالت و انصاف کا ذمہ دار ہو۔

خیر عالم فرض و خیال میں سہی ایک مکمل جامع قانون زندگی تیار ہوگیا، لیکن یہ مرحلہ اب بھی باقی رہ گیا کہ اس ایمان و اخلاق سے بے نیاز دنیا میں اس قانون کا صحیح اجراء و نفاذ کیونکر ہوگا؟ جن افراد کے ہاتھوں میں نفاذ قانون کا حق دیا گیا ہے۔ اُنہیں کس طرح قابو میں رکھا جائے گا؟ ممکن ہے کہ اُن کا نگران ایک جماعت

کو بنا دیا جائے اور اُس کا ناظر کچھ اور لوگوں کو قرار دے دیا جائے لیکن اگر سب متفق ہو کر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں تو اُن کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ دیانتداری کے ساتھ اجراء قانون کی ذمہ داری صرف مذہب اپنے کاندھوں پر لے سکتا ہے۔ یہ طاقت مذہب ہی میں ہے کہ صاحبان اقتدار کے دل و دماغ میں سرایت کر کے اُن کے افعال و اعمال کی نگرانی کرے، انہیں راہِ حق و انصاف سے سرمو نہ ہٹنے دے۔ اُن کے ہر حرکت و سکون کا خود انہی کو ناظر بنا دے۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب کی ضرورت عوام الناس کو ہے۔ متمدن تعلیم یافتہ طبقہ اُس کا محتاج نہیں ہے لیکن اتفاق سے حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ چونکہ اقتدار اسی بلند طبقہ کے ہاتھ میں رہتا ہے لہذا مذہب کی پابندیوں کی اُسے بیشتر احتیاج ہے۔ یہ مسلم ہے کہ اخلاق و ایمان کے قیود سے عوام بے نیاز نہیں ہیں۔ عوام کے اخلاقی اقدار ملحوظ رکھنے سے صاحبانِ اقتدار کے واسطے اجراء قانون کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عام لوگوں سے بدرجہا زیادہ اونچے طبقہ کے لئے مذہب کی پابندی لازمی ہے۔

جس فضا میں ایمان و اخلاق کی حکومت ہو جہاں مذہب کا اقتدار و تسلط ہو وہاں حکومت اور عوام حاکم اور محکوم، رئیس و

مزدوس، مزدور اور سرمایہ دار تمام طبقوں کے پیش نظر ایک مقصد ہوتا ہے۔ ایمان و اخلاق کی تحریک سے وہ اجرا و قانون کی مہم میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جس ماحول میں مذہب اور اخلاق کا اقتدار نہیں ہے۔ وہاں یہ تمام طبقے ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ ہیں اور بجائے باہمی امداد و تعاون کے اُن کے درمیان بات بات پر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اخلاق و ایمان کا تسلّط بھی صاحبانِ اقتدار کو اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھانے سے باز نہیں رکھ سکتا، اس کے لئے غیر معمولی طاقت و قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اقرار ہے کہ اس درجہ کی قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن عام طور پر مذہبی حلقوں کا اخلاقی معیار اتنا بلند نہیں ہوتا ہے۔ موجودہ تہذیب و تمدن اگر مذہب کو اپنے ساتھ لے کر چلے تب بھی مشکلات زندگی حل نہیں ہوں گے۔

البتہ ہمیں بھی اس پر اصرار نہیں ہے کہ مذہبی اقتدار کے بعد سو فیصدی کامیابی حاصل ہوگی۔ ایمان اور اخلاقی تربیت سلمانؓ و ابوذرؓ نہ پیدا کریں لیکن عام طور پر اخلاقی سطح ضرور اونچی ہو جائے گی بہت سے افراد کا اخلاقی معیار اتنا بلند ہو جائے گا کہ اجرا قانون کی ذمہ داری انہیں سونپی جا سکے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ قانون کے صحیح طور سے نفاذ کے ضامن صرف ایمان و اخلاق ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں

کے علاوہ کوئی قابلِ اطمینان وسیلہ موجود نہیں ہے۔ اب اگر کہیں کے لوگ سو فیصدی ایمان و اخلاق کے پابند ہیں تو سو فیصدی نفاذ قانون میں کامیابی ہوگی اور اگر کہیں پچاس فیصدی مذہب کا اثر ہے تو وہاں صحیح طور پر پچاس فیصدی اجراء قانون ہو سکے گا۔

آج کل کسی امر کے متعلق تجربہ و مشاہدہ اُس کے ثبوت کا یقینی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ دینی مرجعیت و ریاست جن اشخاص کو حاصل ہو جاتی ہے اُن کے اقتدار کے حدود کتنے وسیع ہو جاتے ہیں۔ اس غیر معمولی مالی و غیر مالی اقتدار کے باوجود ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ اس سے نہ خود کوئی نمایاں فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اُن کے قریبی اعزا و اقارب اور احباب کو کوئی غیر معمولی فائدہ پہونچتا ہے۔ آخر کس چیز نے اُن کے ہاتھوں کو باندھ دیا ہے، آخر کیوں ان کی بڑی بڑی جائیدادیں نظر نہیں آتیں کیوں اونچی اونچی سر بفلک عمارتیں اُن کی ملکیت میں نہیں ہوتیں، کیوں ان کی بڑی بڑی تجارتیں دکھائی نہیں دیتیں، کس لئے اُن کے یا اُن کے اعزا کے نام بنکوں میں لاکھوں روپیہ جمع نہیں ملتا ہے؟ یقیناً اس دیانتداری کا محرک صرف احساسِ مذہبی ہے۔

کسی کے مرنے کے بعد اُس کا ذکر تملق اور خوش آمد پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی آیۃ اللہ بروجردی طاب ثراہ جن کے ساتھ سے دنیائے شیعیت کچھ عرصہ پہلے محروم ہوئی ہے ایک عظیم اقتدار کے مالک انسان تھے

---

۵ ۱۲ار شوال ۱۳۸۰ھ روز پنجشنبہ مطابق ۳۰ر مارچ ۱۹۶۱ء

اُن کی مالی حیثیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ نجف اشرف اور ایران کے علمی مرکزوں پر اُن کے ماہانہ اخراجات دس لاکھ پونڈ تھے۔ یہ کوئی سنی سنائی افواہ نہیں ہے۔ سرکار مرحوم کے اُن معتمدترین افراد سے میں نے بات چیت کی ہے جن کے ہاتھوں سے یہ رقم خرچ ہوتی تھی۔ محض نجف اشرف کے جامعہ علمیہ پر آیۃ اللہ بروجردی نو ہزار پونڈ ماہانہ صرف فرماتے تھے۔ یہ مرتبہ صرف سرکار مرحوم کو حاصل نہیں ہوا بلکہ اُن کے قبل دوسری مقدس شخصیتوں کو برابر حاصل ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی دینی مرجعیت کے اس مرتبہ پر خاندان اجتہاد کے اسلاف شاہان اودھ کے عہد میں نظر آتے ہیں۔ دنیا بتائے کہ اُنھوں نے اپنے اس اقتدار سے کیا شخصی فائدے اٹھائے؟ یہ مسلسل اور متواتر مشاہدہ و تجربہ اس بات کی مضبوط دلیل ہے کہ ایمان و اخلاق کی پابند یاں صاحبان اقتدار کو صحیح راستہ سے بڑی حد تک نہیں ہٹنے دیتی ہیں بلا ایمان و اخلاق کی پابندی کے اس طرح کی مثالیں اکّا دکّا ملتی ہیں جنھیں بلا پس و پیش اتفاقی کہا جا سکتا ہے۔

اخلاق کا سرچشمہ

مذہب کا انکار کر کے انسان کا اخلاقی معیار بلند کرنے کی کوشش بڑا غیر دانشمندانہ اقدام ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ کی روشنی میں اتنا مسلّم ہونا چاہیئے کہ بلند انسانی اخلاق و صفات کا تحفظ صرف مذہبی

عقائد کی بنیاد پر ہو سکتا ہے ۔گزشتہ انسانی تاریخ اس حقیقت کی پُرزور تائید کرتی ہے ۔ مذہب کو مانتے ہوئے اخلاقی اقدار کا تحفظ یقینی ہے لیکن مذہب کے دیس نکالے کے بعد وہ مشکوک ہے ۔موجودہ تمدنی دنیا بہت تیزی سے مذہبی تعلیمات سے دور ہو رہی ہے بلکہ وہ مذہب کو خیرباد کہہ چکی ہے ۔ وہاں کا اخلاقی انحطاط ہمارے دعویٰ کا جیتا جاگتا شاہد ہے ۔

مناسب ہے کہ یہی بات ایک ایسے شخص کی زبان سے سنئے جس کی زندگی کا بیشتر حصہ جدید تہذیب و تمدن کے مرکز فرانس میں گزرا ہے ۔یورپ کے مشہور عالم ، مختلف علوم و فنون کے ماہر " کامیل فلاماریون " کا کہنا ہے ۔

" ہم جس اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں اُس سے ہمیں بے چین اور شرمندہ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ ہم نے خوشی سے اپنے کو اُس کے سپرد کیا ہے ۔موجودہ تہذیب و تمدن سے بلا زحمت و مشقت دولت سمیٹنے کے علاوہ کوئی فائدہ پہونچا ! ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں لیکن صحیح راستوں سے نہیں بلکہ دوسروں کو فریب دے کر ، انہیں غافل بنا کر ہم چاہتے ہیں کہ اجتماعی اصول و فرائض کے لئے ہم کسی قیمت کے قائل نہ ہوں ــــــ ہماری زندگی میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے علمی و فنی لحاظ سے ہم ترقی کے بلند ترین درجہ پر پہونچ گئے

جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ایسی ایسی کامیابیاں نصیب ہوئیں جنہوں نے ہمارے دماغ کو عرش پر پہونچا دیا لیکن انسانیت و اخلاق کے اعتبار سے انحطاط اور پستی کے انتہائی گہرے گڑھوں میں گر گئے ہیں۔ واقعاً یہ بڑی افسوسناک بات ہے ایک طرف برابر ہمارے اقتدار کے حدود وسیع ہوتے چلے جا رہے ہیں دوسری طرف مادی لالچوں اور خواہشوں کے چھا جانے کے سبب سے ہماری حرارت قلبی، ہمارے نشاط روح کا چراغ بجھ گیا ہے۔"

(ماخوذ از دائرۃ المعارف)

یورپ میں اخلاق و مذہب کے درمیان جدائی ڈال دینے کے نتائج آپ نے ایک یورپین کی زبانی سنے۔ درحقیقت مذہب کو خیرباد کہہ کر اخلاقی اصلاح کا بیڑا اٹھانا بنیادی طور پر نہایت نامعقول ہے۔ عالم خیال میں بڑی بڑی عمارتیں فضا میں معلق تیار کی جا سکتی ہیں لیکن یہ مسلّم ہے کہ بیرونی دنیا میں اُن کا وجود بلا اساس و بنیاد نہیں ہو سکتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ خالص مادہ پرست جماعتوں میں بھی کچھ بلند انسانی اخلاق و اوصاف نظر آتے ہیں، یہ بھی ظاہر ہے کہ ان جماعتوں کے افکار و اذہان مذہبی عقائد سے بالکل متاثر نہیں ہیں، یہ ہمیشہ

مذہب سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔ اس مسئلہ کو سلجھانے کے ملئے ہمیں ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنا پڑے گا۔ ان جماعتوں کے درمیان اُن کے گزشتہ مذہبی تعلیمات کی پچھلی تاریخ پر نظر کرنا ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُنہی سابق تعلیمات کے کچھ اثرات روحانی وفکری وراثت کے طور پر باقی رہ گئے ہیں جنہیں مادی تہذیب و تمدن رفتہ رفتہ مٹا رہا ہے

عقل و انصاف سے کام لیجئے کیونکر ممکن ہے کہ عقلمند آدمی بلا مذہبی عقائد کے، بلا خدا اور روزِ آخرت پر ایمان کے اپنے یقینی مادی منافع کو اپنے پیروں سے خود روند ڈالے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ بلا کسی مادی محرک کے صرف نیکوکاری، حق شناسی، عدل و ایثار پروری کی خاطر ان فوائد کی طرف سے آنکھیں بند کرلے۔

فرض کیا جاسکتا ہے کہ ہر قوم میں ایک یا چند ایسی فردیں دستیاب ہو جائیں جو اپنی مادی ذہنیت کے باوجود تمام اچھے صفات اور بلند اجتماعی فضائل کو محض انکی خاطر آپ منافع بازی سے قطع نظر کر کے اختیار کرلیں لیکن اس کو اجتماعی بحثوں میں ہرگز کوئی اہمیت نہیں دیجاسکتی یہاں مباحث کی عمارت قوم کے عمومی طرزِ تفکر کی بنیاد پر بلند کی جاتی ہے۔ شاذو نادر مثالوں کو اساسی حیثیت نہیں دی جاسکتی، قانون و دستور کے طرز اسلوب کا اُنہیں معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ہمیں انکار نہیں ہے کہ اخلاق کی لفظ آج بھی زبانوں پر آتی ہے اُسے وہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں جن کی ذہنیت تمام و کمال مادیت کے قالب میں ڈھل چکی ہے۔ البتہ محض لفظ زبانوں پر ہے اُس کے

صحیح معنی بالکل مسخ ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی اُس کی وضاحت میں یوں کہا جاتا ہے کہ ہر وہ بات جو انسان کے طبعی رجحان اور فطری میلان کے موافق ہو اخلاق ہے۔ بقول کمیونسٹوں کے جو دنیا کی ہر چیز کو اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ "ہر وہ چیز جو سرخ انقلاب کے لانے میں مدد کرے اور اشتراکی حکومت کے قیام کے لئے وسائل فراہم کرے اخلاق ہے"۔ .... اگر آپ "ہر چیز" اور "ہر بات" کے مفہوم میں غور و فکر کیجئے کہ اس کے دائرہ میں کون کون سی باتیں داخل ہو جائیں گی۔ تو خود بخود آپ کے سامنے موجودہ اخلاقی پستی کے اسباب آجائیں گے۔

ایک عظیم غلط فہمی کا دفعیہ

بعض زبانوں پر یہ بات آئی ہے کہ مادی ذہنیت کی متمدن جماعتوں میں اگرچہ اجتماعی اخلاق و فضائل اپنے مخصوص ناموں کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ تاہم ان کے مظاہر و نتائج نیست و نابود نہیں ہوئے ہیں۔ اور نہ کبھی فنا ہوں گے۔ فرق یہ ہے کہ مذہب کے دورِ حکومت و اقتدار میں اُن کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب معنوی امور تھے اور آج کل اُن کا اصلی سبب خود غرضی، منفعت طلبی اور سود پرستی کے مادی احساسات ہیں۔ ان خالص مادہ پرست قوموں میں بھی ایسے افراد ملیں گے جو ملکی و قومی کاموں میں دل کھول کر مالی امداد

کرتے ہیں۔ جنہوں نے رفاہ عام کے لئے بڑے بڑے اسپتال، عظیم کتب خانے، شاندار کالج قائم کردیے ہیں۔ اُن کے ان اجتماعی خدمات کی پشت پر مذہبی عقائد اور اخلاقی تعلیمات نہیں ہیں بلکہ اسی مادی ذہنیت نے اُنہیں ان کاموں کے لئے آمادہ کیا ہے۔ اُن کا نظریہ ہے کہ قوم کے افراد کی حفاظت و ترقی ہر شخص کے مادی منافع کے تحفظ کے واسطے ضروری ہے۔ اسی بنا پر ہر آدمی اپنے منافع تک رسائی کی خاطر یہ لازمی سمجھتا ہے کہ حتی الامکان اپنی قوم کے تحفظ کی کوشش کرے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ میرا شخصی مفاد قوم کے مجموعی مفاد سے وابستہ ہے۔ درحقیقت جس راستہ پر دیندار مذہبی و اخلاقی تعلیمات کی روشنی میں چلتے ہیں۔ اُسی کو مادہ پرست انسان سود پرستی اور خودخواہی کی تحریک سے طے کرتے ہیں۔

یہ بات سرسری نظر میں خوبصورت اور مستحکم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تھوڑے سے غور و فکر کے بعد پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ایک سراب ہے جسے پانی سمجھ کر اُس کی طرف دوڑ گئے ہیں۔ یقیناً اگر قومی اور ملکی خدمات، افراد و اشخاص کے باہمی حقوق کے پاس و لحاظ کا اصلی محرک مذکورہ بالا مادی نظریہ کو قرار دیا جائے تو اُن خدمات کا دائرہ اتنا محدود اور مختصر ہو جائے گا۔ جس کی کوئی اجتماعی قیمت نہیں رہ جائے گی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس نظریہ کا لازمہ یہ ہے کہ جب

کوئی شخص کسی فرد یا جماعت کی کوئی خدمت کرنا چاہے تو اولاً اُس کو حساب لگانا چاہیئے کہ اس فرد یا اس جماعت سے بواسطہ یا بلاواسطہ مجھے اتنا ہی یا اُس سے زیادہ کوئی فائدہ پہونچے گا یا نہیں۔ اگر فائدہ کی امید ہو تو اقدام کرے ورنہ باز رہے۔

اس خیال کی رو سے ہمیں اُن بیمار بوڑھوں کی کوئی مدد نہ کرنا چاہیئے جو اگر صحت یاب ہو کر چند برس ضعف و اضمحلال کے ساتھ زندہ بھی رہ جائیں تو ہم کو یا کسی دوسرے شخص کو کوئی معمولی سا فائدہ نہیں پہونچا سکتے۔ اسی طرح اُن کم سن بچوں کو بھی کوئی سہارہ نہ دینا چاہیئے جن کے بڑے اور فائدہ پہونچانے کے قابل ہونے تک ہم دنیا سے چل بسیں گے۔

اگر اس موقع پر امداد کا مقصد ملک و قوم کے دوسرے قابل استفادہ افراد کا اپنی طرف متوجہ کرنا ہو تو اس کے متعلق بھی یقینی نہیں ہے کہ وہ ہماری خالی ہو چکنے والی جیب کو دوبارہ بھر دے۔ اس کے علاوہ اس مقصد کے پیشِ نظر اُن غیر مفید ضرورت مندوں کی پوشیدہ طور سے کوئی خدمت نہ کرنا چاہیئے بلکہ ایک پیسہ بھی دیا جائے تو ہر طرف اس کا ڈھنڈھورا پیٹنا ضروری ہے تاکہ دوسرے کان کھڑے کریں اور نگاہ اٹھا کر دیکھیں۔ ہمیں آیندہ نسل کی حفاظت و ترقی کے لئے کوئی کوشش نہ کرنا چاہیئے اس کے اوپر دولت خرچ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ ہمارا

اور اُن کا دورِ زندگی مختلف ہے تو آخر کیوں اُن کے سود و بہبود کی خاطر ہم اپنے یقینی منافع سے آنکھیں بند کریں بخصوصیت سے لاولد اور لاوارث افراد کو قوم کی آیندہ نسل کے لئے قطعاً کوئی اجتماعی خدمت نہ کرنا چاہیئے۔ پھر ایسے شخص کے متعلق ملکی و قومی بہبودی کے سلسلہ میں جان کی قربانی کا تو کبھی سوال ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بہت سے ملکوں میں آبادی زیادہ ہونے کی بنا پر لوگوں کی جان بچانا افراد ملک کے مادی سود و بہبود کے لئے قطعاً ضرر رساں ہے۔ آبادی کی زیادتی طرح طرح کی زحمتیں اور کشمکشیں پیدا کرتی ہے۔ چین ہندوستان اور اسی قسم کے دوسرے ممالک میں تندرست و صحت مند افراد کو پرزور مطالبہ کرنا چاہیئے کہ تمام اسپتال توڑ دئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ بیمار شفایاب ہو کر ضروریاتِ زندگی میں تندرستوں کے برابر سے شریک ہو جائیں گے۔ یہ موجودہ تمدن کے منفعت طلب اور خود غرض طرزِ تفکر کے بالکل خلاف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن سے متاثر ملکوں میں شفاخانے تعلیمی ادارے، دوسرے اجتماعی مرکز کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اِن کا سبب وہ مادی نقطۂ نظر نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ دو سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ خیالات جو مذہب و اہلِ مذہب کی ہزارہا سال کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں ابھی بالکل دماغوں سے محو نہیں ہوئے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی جلدی اُنھیں مٹنا بھی نہیں چاہیئے۔ یقیناً وہ نقوش رفتہ رفتہ سالہا سال میں مسلسل و مستمر مادی تعلیم و تربیت کے بعد اپنا بوریا بستر باندھیں گے۔ ابھی مدتوں انسان کے طبقات شعور میں اُن کی چنگاریاں سلگتی رہیں گی۔ دوسرے یہ کہ متمدن ملکوں میں اس طرح کے اجتماعی مرکزوں کی تاسیس و تعمیر اکثر حکومت کی طرف سے ہوتی ہے، افراد ملک سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، حکومتیں باشندگان ملک سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کر کے اُن کی عمومی خیر خواہی و بہبودی اور دوسرے ممالک کی نظر میں اپنی نیک نامی کے پیش نظر اجتماعی خدمات انجام دیا کرتی ہیں۔ ان ٹیکسوں کی وصولی بعض افراد کی طبیعتوں پر بار ہوتی ہے، وہ بجبر و اکراہ حکومت کے دباؤ میں آکر انہیں ادا کرتے ہیں۔ ان کے بالمقابل بہت سے سلجھے ہوئے سنجیدہ لوگ یہ ٹیکس خوشی سے حکومت کو دیتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے عوض میں حکومت ہمیں صحت، تعلیم، صفائی، امن و اطمینان دے گی۔ حکومت اسی رقم سے باشندگان ملک کے لئے اسپتال، تعلیم گاہیں، سڑکیں، نہریں، دریاؤں پر پل، صنعتی کارخانے، پارک وغیرہ بنا دیتی ہے۔ ملکی باشندوں کا یہ اقدام براہ راست اپنی خدمت ہے اس میں دوسرے افراد کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ان ممالک میں اکثر تعلیمی ادارے، شفاخانے تمام

اجتماعی مرکز عمومی نظر آئیں گے ۔ ایسے ادارے کم ملیں گے جو غریبوں اور محتاجوں سے مخصوص ہوں ۔ عام طور پر یہی دکھائی دے گا کہ تمام افرادِ ملک اُن سے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ اس قسم کے اداروں کی بنیاد نوع پروری بخاطر خود پروری کا نظریہ نہیں ہے بلکہ اُن کی عمارت ازاول براہِ راست خود پروری کی ذہنیت پر بلند ہوئی ہے، نوع پروری کا قدم درمیان میں نہیں ہے ۔

ملکی و قومی خدمات کے سلسلہ میں نوع پروری بخاطر خود پروری مادی نظریہ کے جو چند پیش افتادہ تقاضے تھے انہیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بیان کیا گیا ۔ حامیانِ مادیت نے ابھی اس سوال کا جواب نہیں دیا ۔ کہ مذکورہ نظریہ کے زیرِ قیادت افراد و اشخاص کے باہمی حقوق کا تحفظ کیونکر ہوگا؟

اِس بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ اسی نقطہ نظر کی روشنی میں ہر شخص اپنے دل میں سوچے گا کہ اگر آج میرے ہاتھ میں طاقت و اقتدار ہے تو مجھے اُس سے غلط فائدہ اٹھا کر دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کرنا چاہیئے، اُن کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ یہ قوت و طاقت بقولے ہوا کے جھونکوں اور جھولے کے پینگوں کی طرح آتی جاتی رہتی ہے، آج میرے پاس ہے کل دوسرے کے قبضہ میں ہے ۔ اس لیے وفا پر بھروسہ کرنا بے احتیاطی ہے ۔ اگر آج میں نے دوسروں کے حقوق کو کچل دیا تو کل وہ بھی میرے

حقوق سے کھیلیں گے۔ اُن کا کوئی لحاظ نہیں کریں گے۔ دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ ہمیشہ راحت و آسائش اور امن و سکون سے زندگی بسر کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ملکی و قومی قوانین کا احترام کیا جائے۔

کوئی شبہ نہیں کہ فرض و امکان کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن تمدّنی مسائل کو امکانات کی بنیاد پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ روزمرہ کے مسلسل و متواتر تجربات و مشاہدات کے بعد انسان سے یہ حسن ظن بہت تعجب خیز ہے۔ ہمیں اجتماعی مسائل پر عام انسانی ذہنیت کی روشنی میں نظر ڈالنا چاہیئے۔ کسی ملک کی آبادی میں ایسے دانشمند دور اندیش ایک فیصدی بھی مشکل سے ملیں گے ایسے بہت کم لوگ ہیں جو آئندہ کے احتمالی منافع کے تحفظ کی خاطر اپنے موجودہ یقینی منافع سے چشم پوشی کریں۔ اس متمدن دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے لئے عدالت نے سزائے موت کا فیصلہ کر دیا ہو، وہ پولیس کی حراست سے نکل کر اپنے کو اُن کے شکنجہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود محض قانون کا احترام کرتے ہوئے وہ اپنی جان موت کے سپرد کر دے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ دنیا میں نہیں رہے گا تو قانون کا ہونا نہ ہونا اُسے کون سا مادی فائدہ پہونچا سکتا ہے؟ وہ احترام قانون کا لحاظ کیوں کرے؟ ہر شخص سقراط نہیں بن سکتا کہ قید خانے سے بھاگ سکنے کے باوجود

رکا رہے اور صرف حفاظت قانون کی خاطر جامِ زہر پی کر گوشۂ زنداں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو رہے۔

پھر جن افراد کے حقوق انسان کے ذمہ عائد ہوتے ہیں اُن کی حیثیت و نوعیت مختلف ہوا کرتی ہے۔ ان میں سے کچھ نمایاں افراد کے متعلق آئندہ صاحبِ اقتدار ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ چونکہ اُن سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے لہذا اُن کے حقوق کا لحاظ کیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت و اقتدار آنے کی بالکل توقع نہیں ہے۔ ایسے کمزور افراد کے حقوق کی حفاظت مادی نقطہ نظر سے کس طرح ہو گی؟

کسی نظریہ کے صحیح و معقول ہونے کی بہترین دلیل اس کا عملی انطباق ہے۔ واقعاً اگر یہ درست ہے کہ انسان خود خواہی و خود پرستی کی بنا پر اجتماعی اخلاق کے تمام تقاضوں کا لحاظ کرتا ہے، دوسروں کے حقوق کی حفاظت اس لئے کرتا ہے کہ وہ بواسطہ اپنے شخصی حقوق کا تحفظ ہے تو اس کا براہِ راست نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ جرائم کی تعداد گھٹتی جائے۔ آپس کے باہمی معاملات میں ظلم و زیادتی کا تناسب کم ہوتا جائے، حالانکہ متمدن دول و اقوام کے یہاں جرائم کی جو تعداد ہمیں معلوم ہوئی ہے۔ اُس سے بالکل اُلٹا نتیجہ نکلتا ہے۔

دو سال پہلے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ نے لکھا تھا۔" سات

سال سے امریکہ میں جرائم کی تعداد بڑھ رہی ہے - اس سال کے اعداد وشمار اس طرح بیان کیے جاتے ہیں:-

روزانہ بطور اوسط ۳۴ قتل
" ۲۵۶ زخمی
" ۳۶۸۰ چوریاں

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک سال میں بارہ ہزار چار سو دس جانیں تلف ہوتی ہیں - ترانوے ہزار تین سو چالیس آدمی زخمی ہوتے ہیں اور تیرہ لاکھ تینتالیس ہزار دو سو چوریاں ہوتی ہیں -

جرائم کی اس ہولناک تعداد کے بعد کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ مادی طرز تفکر اخلاقی تعلیمات کی جگہ پُر کر دے گا، وہ ایک وقت میں تمام نوع انسانی کو ہمہ گیر سکون و اطمینان کے آغوش میں سُلا دے گا؟ کیا دنیا کے متمدن ترین ملک کی اس صورت حال کے سامنے آجانے کے بعد باور کیا جا سکتا ہے کہ دیندار جس راستہ پر مذہب کے قدموں سے چلے ہیں مادہ پرست انسان اسی کو مادی ذہنیت کی مدد سے طے کر لیں گے؟

کون نہیں جانتا کہ آخری دونوں جنگوں کی آگ انہی جدید تہذیب و تمدن کے علم برداروں نے بھڑکائی تھی - ان جنگوں میں کروڑوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں بے شمار آدمی زخمی اور اپنے ہاتھ پیروں سے محروم ہوگئے، لاکھوں مکان، کارخانے، اسپتال، کالج اور

دوسرے مفید ادارے جل کر خاکستر ہو گئے۔

اگر سچ مچ یہ نظریہ صحیح ہے کہ جدید متمدن انسان خود غرضی اور مفاد خواہی کے اصول کی تحریک سے دوسرے افراد انسانی کے جان و مال کا تحفظ ضروری سمجھتا ہے اور عملی طور سے اُس کی پابندی کرتا ہے تو ان تہذیب و تمدّن کے مشعلداروں نے کس لئے ایسے ایسے غیر انسانی کام کئے جن کی مثال اُس جہالت و بربریت کے دَور میں بھی نہیں ملتی ہے۔ ظلم و بے رحمی کے ایسے ایسے مظاہرے جنہوں نے انسان کی پیشانی کو عرقِ انفعال سے شرابور کر دیا اور اُس کے پُر غرور سر کو درندوں کے سامنے جھکا دیا۔

ملکی و قومی رہنما اور اخلاقی تربیّت

یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ عوام کا نہ اپنا کوئی نظریہ ہوتا ہے اور نہ کوئی طریقۂ کار، وہ بالکل سلاطین وقت کے آئین و رفتار کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ عوام بادشاہوں کے افکار و نظریات کا مکمل آئینہ سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی اخلاقی بلندی و پستی عوام کی اخلاقی و مذہبی حالت پر پورے طور سے اثر انداز ہوتی ہے۔ مشہور مقولہ ہے " النّاس علےٰ دین ملوکھم "

یہ شہنشاہیّت و آمریّت کے زمانہ کا ذکر تھا۔ آج کل جمہوریّت کے دَور میں جب کہ کہا جاتا ہے کہ قوم کی حکومت قوم کے اوپر ہوتی

ہے معاملہ بالکل اُلٹا نظر آتا ہے۔ آجکل حکومت و اقتدار کے ذمہ دار عوام کے نظریات و افکار کے پابند ہوتے ہیں، اُن کی خواہشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے خیالات و رجحانات کے گرد ناچتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کی کمزوریوں کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اُن کے نقائص و عیوب کی دیکھ بھال سے عاجز ہیں۔ چونکہ ان کے برسرِ اقتدار لانے والے، ان کے لئے دائرہ کار معین کرنے والے عوام ہیں، چونکہ یہ قوم کے نمائندے، اہل ملک کے انتخاب کردہ ہیں لہذا اپنے درجہ کے تحفظ کی خاطر اُن کے سامنے بس یہی ایک راستہ ہے کہ یہ قوم کی خواہشوں کو پورا کرنے اور اکثریت کے خیالات و رجحانات کی ہوائیں اُڑتے ہیں۔

یہ ملکی و قومی رہنما نہ صرف یہی کہ عوام کی غلط روی اور کج رفتاری کی اصلاح نہیں کر سکتے، اُن کے دامن سے مفاسد و نقائص کے دھبوں کو دھو نہیں سکتے بلکہ قوم میں مقبول اور ہر دل عزیز بننے کی غرض سے اُنہیں ان کے عیوب کو سراہنے کی ضرورت ہے، اُن کی حقیقی کمزوریوں کو دبانے کی احتیاج ہے۔ بہرحال یہ لیڈر اچھے یا بُرے قوم کے افکار و احساسات کے نمائندے ہیں۔ اس کا سبب بھی واضح ہے کہ خود کسی مستقل اقتدار کے مالک نہیں ہیں۔ اُن کے پاس جو کچھ ہے قوم کا عطا کردہ ہے جس روز اُن کی طرف سے قوم اپنی نگاہیں پھیر لے سارا ان کا نفوذ و اقتدار خاک میں مل جائے اور دوسرے افراد کی طرح ایک

معمولی فرد قوم انہیں سمجھا جانے لگے۔ اُن کی شخصیت جتنی بھی یا فذن اہم اور صاحب اقتدار ہو ریل کے انجن کے مثل ہے جو اپنی غیر معمولی سنگینی اور طاقت واختیار کے باوجود مجبور ہے کہ اسی باریک لوہے کی پٹری پر چلتا رہے جسے اُس کے واسطے معین کردیا گیا ہے اِن ملکی وقومی رہنماؤں کے ضمیر مُردہ ہوتے، ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، ان کی جرأت اظہار جواب دے دیتی ہے۔ وہ عوام کی آنکھوں سے دیکھتے اور اُن کے کانوں سنتے ہیں۔ اکثریت کے اشاروں پر چلتے اور ہمیشہ اُن کے مفادات کو مقدم رکھتے ہیں۔ اُن کے کان اقلیت کی آوازوں کو نہیں سنتے، اُن کی آنکھیں اُس کے حقوق وفوائد کو نہیں دیکھتی ہیں ان کی نظر میں حق وانصاف کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ اکثریت کو سب سے بڑی طاقت اور اُسی کی پرستش کو اپنا مقصد زندگی بناتے ہیں۔

اخبارات ومطبوعات

جن ملکوں میں قانون بنانے اور حکومت چلانے کا حق عوام کو ہوتا ہے وہاں کے اخبارات اور دیگر مطبوعات کی حالت بھی ان عوامی لیڈروں کی حالت سے مختلف نہیں ہوتی ہے۔ وہ قوم کی آواز، افکار عوام کے نمائندے کسی خاص پارٹی کے آرگن ہوتے ہیں۔ باشندگان ملک کی اکثریت میں پیدا شدہ مفاسد کے سلسلہ میں وہ بھی کوئی جرأت مندانہ اقدام نہیں کرسکتے۔ اُن میں یہ ہمت ہوتی کہ وہ غلط رو اسم

وعادات اور عام انحطاط اخلاقی کا بے باکی سے مقابلہ کر سکیں۔ اکثریت کے گہرے رجحانات کے خلاف وہ کوئی موثر کوشش نہیں کر سکتے۔

ان اخبارات ومنشورات میں عموماً تجارتی پہلو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اُن کی آمدنی اور خرچ دونوں کا بالراہِ راست تعلق ان کی بکری پر ہے اور یا اپنی اس پارٹی کی جیب پر جس کے وہ آرگن ہیں۔ بہر صورت اگر یہ کوئی ہلکا سا قدم بھی قوم کی اکثریت کے رجحان ومیلان کے خلاف اٹھائیں تو نہ محض یہ کہ اُن کی ہر دلعزیزی ختم ہوجائے بلکہ فوراً ان کی آمدنی پر اثر پڑے اور زندگی کی شہ رگ ہی کٹ جائے۔ رہ گئے پارٹی آرگن اُن کی پالیسی پہلے سے معین ہوتی ہے۔ انہیں حق ناحق اپنی جماعت کی بہرحال حمایت کرنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس طرح کے اخبارات کا واحد مقصد اہلِ ملک کی اکثریت کے افکار ونظریات کی عکاسی ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ اصلاحی اقدامات کیونکر کر سکتے ہیں۔

کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ اکثریت کبھی دھوکا نہیں کھاتی اس سے غلطی نہیں ہوتی، وہ صحیح راستہ سے نہیں ہٹتی۔ اُس کے مطالبات ملک وقوم کے مجموعی مفادات سے نہیں ٹکراتے، اس کی خواہشیں ہمیشہ اجتماعی سود وبہبود مطابق اور ہم آہنگ رہتی ہیں۔ ایسے بلند وبالا دعوے کوئی کیسے کرے جب کہ اکثریتوں کی غلطیاں روز روشن کی طرح نمایاں ہو چکی ہیں۔ اُن کی غیر معتدل بیجا خواہشوں نے ہمیشہ اقلیتوں کے حقوق کا گلا گھونٹا ہے۔ اس کے ساتھ یہ

بھی مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ان اکثریتوں کی رہنمائی مختصر توجہ دہانیوں سے نہیں ہو سکتی۔ ان کی ذہنی و عملی کجروی کو سدھار نے کے لئے معمولی اور ہلکی تنبیہیں کار آمد نہیں ہو سکتیں۔ اکثر و بیشتر مواقع پر تعلیم و تلقین اور پند و نصیحت کے بجائے کھلم کھلا ڈٹ کر مقابلہ کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اخبار اور روزنامے جو اکثریت کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلتے ہیں، جن کی زندگی کا سہارہ اکثریت کی نظر التفات ہے، جو اُس کی بے توجہی کو اپنی موت کا یقینی پیغام سمجھتے ہیں بھلا اُن کے قدم اس کے مقابلہ میں کہاں ٹھہر سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جن ملکوں میں شہوت رانی کا دور دورہ اور جنسی آوارگی کی آزادی ہے۔ وہاں اخباروں اور رسالوں کے صفحات کا بیشتر حصّہ عشق و محبّت کے خود ساختہ تحریک آمیز افسانوں اور ہیجان انگیز تصویروں سے بھرا رہتا ہے۔ یہ سارا نمک مرچ اکثریت کے کام و دہن کو مزے دار کرنے کی غرض سے چھڑکا جاتا ہے۔ ان حیا کے پتلوں اور غیرت کے مجسموں کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں تو اُسے ہمارے پرچہ کے خریدار پسند نہیں کریں گے، کوئی ہمارے رسالہ کو اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ہمیں بہر عنوان لوگوں کی خواہشوں کا خیال رکھتا ہے، اپنے رسالہ کو ہر طرح سے اُن کے واسطے دلچسپ بنانا ہے۔

یہ اخبارات اور رسالے خود کسی مقصد کو لے کر آگے نہیں بڑھ

سکتے۔ اُن کے قلم کی رفتار اکثریت کی ذہنی و عملی رفتار کے مطابق رہتی ہے۔ اکثریت جس چیز کو پسند کرے اُسے یہ خوب اچھالیں گے اور اور وہ جسے اپنی نظر دل سے گرا دے یہ اُسے تحت الثریٰ میں پہونچا دیں گے۔ اِن کا مقصد زندگی ایک اور صرف ایک ہے، وہ اکثریت کی خواہش اور پسند کی غیر مشروط دائمی غلامی!!

موجودہ زمانہ کے منشورات و اخبارات اُن ہوس باز عورتوں کے مثل ہیں جو ہر گھنٹہ کے بعد نئے کپڑے بدل کر لوگوں کے دلوں میں گھر پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔ اور اپنے کو عام ماحول کے مطابق آراستہ و پیراستہ بنانا چاہتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان اخبارات کو خود اپنی کہی ہوئی باتیں بالکل یاد نہیں رہتیں۔ اسی لئے آپ کو ان کی تحریروں میں کھلا ہوا اختلاف و تضاد نظر آئے گا۔ حسن اتفاق سے اس طرح کے مطبوعات ایک ہی روز میں پرانے ہو کر عطاری و بقالی کی دوکانوں پر سودا سلف باندھنے میں کام آجاتے ہیں، اُن کے نوشتوں کے اختلافات پر پردہ پڑ جاتا ہے لوگوں کو توجہ نہیں ہوتی کہ آج یہ کیا کہہ رہے ہیں اور کل انہوں نے کیا کہا تھا۔

ہر شخص کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ روزنامہ اخبار اپنی بکری بڑھانے کے لئے ہر بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ معمولی معمولی واقعات جن کی طرف کوئی شخص اعتنا نہیں کرتا اخبار اُنہی باتوں کو موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ نہایت آب و تاب سے مبالغہ

آمیز طور پر شائع کرتے ہیں۔ اخبارات کے ذریعہ کسی چیز کے صحیح اعداد و شمار کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ حکومتوں کی کڑی نگرانی کی وجہ سے بہت سی سچی باتیں پردۂ خفا میں رہ جاتی ہیں یا انہیں کتر بیونت کے ساتھ سامنے لایا جاتا ہے جو ان کی اصلی صورت کو بالکل مسخ کر دیتی ہے۔ اخبارات کی اس غلط رفتاری نے عوام کی عادتوں کو بھی خراب کر دیا ہے۔ اُن کی باتوں میں مبالغہ آمیزی، ان کی تحریروں میں غلط بیانی کا عنصر حقائق پر پوری طرح چھا چکا ہے۔ اِس کا انجام یہ ہوا کہ بے اعتمادی و بدظنی نے تمام اجتماعی و انفرادی، داخلی و خارجی معاملات کو درہم برہم کر دیا۔ ایک شخص دوسرے شخص پر بھروسہ نہیں کرتا، ایک ملک دوسرے ملک کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔

گزشتہ مندرجات کے ماتحت یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ قوموں اور ملکوں کے مربی اخلاق اور رہنمائے افکار وہ بے لوث افراد ہو سکتے ہیں جو مادی و معنوی ہر حیثیت سے کامل طور پر اپنے زیر تربیت عناصر سے بے نیاز ہوں۔" ان کی شخصیت کی اصلی معمار خود اُنہی کی شخصیت ہو۔ ہر قسم کی ہماری تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اُس باخبر مدبر و حکیم خالق پر عائد ہوتی ہے جس کے علم و اطلاع میں انسان کے کل روحانی و جسمانی تقاضے ہیں۔ اُس کے واجب الوجود ہونے کے ذاتی تقاضہ نے ہماری بلاواسطہ تعلیم و تربیت سے اُسے معذور بنا دیا ہے

اپنے وسیع علم و اطلاع کی بنا پر وہی اُن نمایاں افراد کی شناخت کر سکتا ہے جنہیں ہمارا مربی اخلاق اور اخلاق افکار بنایا جا سکے۔ انبیاء و مرسلین ہی وہ مردانِ وحی و الہام ہیں جن کا ارادہ، جن کی شخصیت جن کی روح و فکر ماحول کے تاثر و انفعال سے بالاتر ہے۔ یہی وہ انسانیت کے ماہر معمار ہیں جو اُسے حریت فکر، پاکیزگی خیال اور رفعت اعمال کی دولت سے مالا مال کر سکتے ہیں۔ یہی افراد و اقوام کی اخلاقی و روحانی بیماریوں کی تشخیص کر کے اُن کے صحیح علاج پر قدرت رکھتے ہیں۔

ان کے بلند افکار سے تراوش کردہ منشورات میں صلاحیت ہے کہ ملک و ملت کے صحیح مفاد کی حفاظت اور انسانیت کی فلاح و بہبودی کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔ انہی میں یہ جرأت و ہمت ہے کہ قوم کے عیوب و نقائص کو علانیہ بیان کر کے اُن کا بھرپور مقابلہ کرتے رہیں۔ یہی وہ مستقل اور ثابت قدم منشورات ہو سکتے ہیں جو کسی ناقابل تبدیل مقصد کو لے کر اٹھیں اور اس کی حمایت و اشاعت میں ہمیشہ منہمک رہیں۔ مادی افکار کے مخلوق اخبارات و جرائد ہر انسانی و اخلاقی خدمت سے قاصر ہیں۔

مذہب اور اخلاق سے بے تعلقی

یہ بات اتنی واضح ہے جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اکثر موجودہ متمدن ملکوں میں مذہبی عقائد و تعلیمات کو قومی دستور العمل سے یا بالکل خارج کر دیا گیا ہے اور یا شخصی زندگی میں رسم و رواج کے طور پر باقی رکھا گیا ہے۔

مغربی ممالک میں چند صدیاں پہلے اور مشرقی ملکوں میں ایک صدی قبل مذہب اور پیشوایانِ مذہب بلا استثناء تمام ملکی و ملّی شعبوں کے نگران تھے۔ پوری قوم کی اجتماعی طاقت اُن کی قوّت کے سامنے سپر انداختہ اور سرنگوں تھی۔ مذہب اور رہنمایانِ مذہب کی موجودہ اور گزشتہ دونوں حالتوں کے درمیان توازن و تقابل انسان کو شدید حیرت و تعجب میں ڈال دیتا ہے وہ سوچتا ہے کہ ان دونوں کا وہ غیر معمولی نفوذ و اقتدار کہاں چلا گیا۔ یہ موجودہ ضعف و اضمحلال کس راستہ سے آ گیا۔

یہ حیرت و استعجاب اُس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب گزشتہ توضیحات کے زیر اثر انسان یہ مان چکے کہ اُس کے انفرادی و اجتماعی مشکلات کا حل بس اُن اخلاقی اصولوں کی پابندی میں ہے جو مذہبی عقائد و تعلیمات کی روشنی میں تیار کیے گئے ہیں ہمیں اس امر کی تصدیق کرنا پڑے گی کہ مذہب کے تخریبی اسباب

اتنے قوی اور پُر زور تھے کہ انہوں نے اس مختصر مدت میں لوگوں کے دلوں سے اُس کے اثرات کو کہیں تو بالکل محو کردیا اور کہیں اتنا کمزور کہ عملی زندگی میں اُن کا وجود و عدم برابر نظر آتا ہے۔
مذہب کے تنزل و انحطاط کا کوئی ایک سبب نہیں ہے۔ بہت سے اسباب نے مل کر عوام کو مذہب اور اخلاق سے دور کیا ہے۔ مندرجہ ذیل امور پر مذہب کا وقار گھٹانے کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے۔

۱۔ روشِ حسّی کا عروج

علوم تجربی و حسّی کے ارتقاء و کمال نے تمام عقول و افکار کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ عام طور پر علماء طبیعی نے موجودات عالم کے باہمی ارتباط و تعلق اور اُس کے مادی اسباب کے انکشاف کے لئے جو راستے بنائے اُن میں عقلی و خیالی پہلوؤں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کی۔ انہوں نے بس تجربہ اور آزمائش پر پورا بھروسہ کیا۔ وسائل آزمائش کی ترقی نے بھی تحقیق کے خالص عقلی راستوں سے ہٹانے میں ان کو سہارا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علوم طبیعی کے تعلیمی کلاسوں کی جگہ بڑی بڑی تجربہ گاہوں نے لے لی۔ اِن علوم میں تصنیف شدہ کتابوں کے بجائے موجودات عالم اور صحیفۂ فطرت کا گہرا مطالعہ شروع ہوگیا۔

"ڈکارٹ" کو موجودہ علمی ترقیوں کا بانی اور روشِ حسی و تجربی

کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے کہ ایک روز اُس کے کسی دوست نے جو اس کی ملاقات کے واسطے گیا تھا اس سے فرمائش کی کہ اپنا کتب خانہ دکھلاؤ۔ ڈکارٹ اس کو اپنے مکان کی پشت پر لے گیا۔ ایک پوست کندہ گائے کے بچھڑے کی طرف اُس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بہترین کتابیں کہ جن کا مطالعہ میں اکثر کیا کرتا ہوں اسی قسم کی ہیں۔ یہ ابتدا تھی اس کے بعد رفتہ رفتہ علوم طبیعی کے تمام تحقیقات حس اور تجربہ کی روشنی میں انجام پانے لگے۔

بڑے سے بڑے حکیم و فلسفی کے نظریہ کو اگر حسی تجربہ کی تائید حاصل نہیں تو وہ مسترد اور اگر بالکل معمولی شخص کا خیال حس اور تجربہ کے مطابق ہو گیا تو بلا پس و پیش قابل قبول تھا۔ حق گوئی سے انسان کو دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس روش حسی کی بدولت علم طبیعی نے غیر معمولی ترقی کی۔ حقائق کائنات کے وہ پیچیدہ راستے جنہیں اس روش عقلی کی رہنمائی میں طے کرنے کے لئے ہزاروں سال کی مدت درکار تھی ایک صدی سے بھی کم وقت میں طے ہو گئے۔

اس روش حسی کے اختیار کرنے سے انسان کو چونکہ بے شمار غیر معمولی فائدے پہونچے لہٰذا علوم طبیعی کے ماہرین اُس سے بیحد متاثر ہو گئے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ علوم مادی کے ساتھ علوم

و فنون کو حس و تجربہ کے دائرہ میں لانے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی نظر میں دنیا کی ہر چیز کی صحت و عدم صحت کا واحد معیار حس و تجربہ قرار پا گیا۔

چونکہ مذہبی عقائد و افکار کو اس کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا لہذا اسے معتبر سمجھنے والوں کی نظروں میں اُن کا کوئی وقار باقی نہیں رہ گیا۔ یہاں تک کہ انہی علماء طبیعی میں سے ایک نہایت مغرور و متکبر پر از نخوت شخص کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کسی موقع پر کہا کہ "جب تک خدا کو کبھی اپنے اس اپریشن کے چاقو کے نیچے نہیں دیکھ لوں گا اُس کے وجود کا اقرار نہیں کروں گا" !!

اس غفلت و جہالت کے پتلے کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ یہ اصول دوسری جگہوں کے لئے بنایا گیا ہے، اُس کی پرورش دوسرے مقاصد کے پیش نظر کی گئی ہے۔ اس کا دائرہ عمل اُن علوم سے مخصوص ہے جن میں محسوس چیزوں کی بابت بات چیت کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی تعلق غیر مادی علوم سے نہیں ہے۔ ہر چیز کو ایک ترازو سے نہیں تولا جا سکتا۔ ہر شے کی واقفیت و عدم واقفیت معلوم کرنے کا ایک وسیلہ نہیں ہو سکتا۔

وہ لوگ کہ جو اس روش حسی کے ذریعہ غیر محسوس امور کا پتہ چلانا چاہتے ہیں اپنے عقل و فہم میں اس شخص سے قطعاً بلند نہیں ہیں جو کسی کی بہادری یا کسی کی محبت کا اندازہ فیتے اور گز کے ذریعہ

سے کرنا چاہتا ہو۔ بخار کی مقدار معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب اگر مریض کو کسی لکڑی کی ٹھیکی پر لے جاکر وہاں ترانہ وبین تو ہیں تو ہر شخص اُن کی قابلیت کا اعتراف کرنے لگے گا۔ دورانِ خون کی مقدار معلوم کرنے کے واسطے تھرمامیٹر استعمال کیا جائے اور جب اُس کی بابت کچھ پتہ نہ چلے تو صاف لفظوں میں فیصلہ کردیا جائے کہ خون کی رفتار بالکل معتدل ہے۔

کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ تجربہ اور آزمائش حقائق کائنات کا پتہ چلانے کا نہایت صحیح اور قابل اطمینان وسیلہ ہے لیکن کہاں؟ صرف مادی وطبیعی علوم ہیں، یقیناً کائنات عالم کے رازوں کو خود انہی کے دل میں ڈھونڈ ھنا چاہیئے۔ غیر محسوس خالص عقلی فضاؤں میں انہیں تلاش کرنا کھلی ہوئی بدسلیقگی ہے۔ اس اندازِ تحقیق کی صحت ومعقولیت کا یہ نتیجہ نہیں ہے کہ ہر جگہ اس سے کام لیا جائے۔ بیشک حرارت جسم کی مقدار مقدار معلوم کرنے کے لئے تھرمامیٹر سے زیادہ اطمینان بخش وسیلہ اس وقت موجود نہیں ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ کسی آدمی کی ذکاوت وفراست، فہم وذہانت کا اندازہ بھی تھرمامیٹر سے کرنا چاہیئے۔

جو شخص یہ کہے کہ میں جب تک خدا کو اپنے پوسٹ مارٹم کے چاقو کے نیچے نہیں دیکھ لوں گا اس پر ایمان نہیں لاؤں گا

ہمارے نزدیک بالکل اسی شخص کے مانند ہے جو یہ کہے کہ جب تک ضرب فیثاغورث کے جدول اور نیوٹن کے قانون جذب وکشش کو میکروسکوپ کے ذریعہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لوں گا ہرگز اُن کی صحت کا یقین نہیں کروں گا۔

بہرحال اس مغالطہ انگیزی نے عوام کے ذہنوں کو مذہبی عقائد سے دور کر دیا۔ اخلاقی قدریں اُن کی نگاہوں سے گر گئیں۔ تمام ان باتوں کی واقعیت کو مشکوک سمجھا جانے لگا۔ جن کا کسی نہ کسی طرح ماوراء حس سے تعلق ہے خوش قسمتی سے اس طرز تفکر کو ماحول بھی ایسا مل گیا جس کی مدد سے عوام نے اُسے بڑے شوق سے قبول کر لیا۔

اسے حقیقت پرستی کی بدبختی نہیں تو اور کیا کہیے کہ اس حیرتناک مغالطہ انگیزی کا زور آج بھی باقی ہے، آج بھی ایک دنیا انتظار کر رہی ہے کہ خدا یا روح کو پوسٹ مارٹم کی میز کے اوپر، میکروسکوپ اور دوربینوں کے ذریعہ آسمانوں کی صاف وشفاف فضاؤں میں یا کہیں اور دیکھ لے۔ آج بھی پولیٹزر اور اُن کے ہم خیالوں کی آوازیں کان سن رہے ہیں کہ "سائنس ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ غیر مادی روح کے وجود کا ہم اعتقاد کر لیں" کون اُن سے کہے کہ سائنس کو اس قسم کی اجازت کا کوئی حق نہیں ہے وہ اجازت دے یا نہ دے یہ حقیقتیں اس کے دائرہ عمل سے

بالکل خارج ہیں۔

رفتہ رفتہ اس ذہنیت کی روشنی میں بات کھنچکر یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ عملی طور پر تفکر و تعقل اور ادراک حسی کو دو ہم معنی لفظ سمجھا جانے لگا۔ ماورا رحس کسی چیز کا ماننا اور ثابت کرنا نہایت مشکل ہو گیا۔

ہمیں بہت زیادہ تعجب نہ کرنا چاہیے کہ وہ صاحبان عقل جنہوں نے آسمانی کرّوں تک پہونچنے کے وسائل پیدا کر دیئے ہیں بعض بدیہی حقیقتوں کا کیونکر انکار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعضاء بدن کی طرح قوائے دماغ بھی کام کرتے رہنے سے قوی اور بیکار رہنے سے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ سے اگر کام نہ لیجیے یونہی فضا میں بلند رکھئے تو ایک مدت گزرنے کے بعد خشک ہو جائے گا۔ ذہنی قوتوں کو جس شعبہ میں زیادہ صرف کیا جائے گا اُس میں وہ برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ اس کے بالمقابل جن چیزوں میں اُن سے بالکل کام نہیں لیا جائے گا اُن کے بارے میں وہ کمزور اور ناکارہ ہوتی چلی جائیں گی۔

موجودہ علماء طبیعی نے چونکہ علوم غیر حسی خصوصاً فلسفہ اور اخلاق سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی، انہوں نے اپنے بلند افکار کو اس شعبہ میں صرف نہیں کیا لہذا نہ صرف ماورا رحس امور کی تصدیق ان کے لیئے دشوار ہو گئی بلکہ ان کا تصور تک محال

ہوگیا۔ مثلاً یہی سابق الذکر "پولیٹسر" اپنی کتاب "اصول مقدماتی فلسفہ" میں لکھتے ہیں کہ "ایسی چیز کا تصوّر علمی حیثیت سے ناممکن ہے جو زمان و مکان کی پابند نہ ہو اور ہر قسم کے تغیّر سے محفوظ ہو"!!

بہر کیف یہ غلط طرزِ تفکّر اس روش تجربی و حسی کے زیرِ اثر عام طور سے ذہنوں پر چھا گیا۔ اس نے مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار پر بڑی کاری ضربیں لگائیں۔ جب تک یہ مغالطہ انگیزی انسانی افکار پر مسلط ہے مذہب اور اخلاق کا اثر پھیلنا بہت دشوار ہے۔ اس وقت مذہب کی بہت بڑی خدمت اس مغالطہ انگیزی کا پردہ چاک کرنا ہے۔ حسنِ اتفاق سے موجودہ علماءِ طبیعی کو اب رفتہ رفتہ اپنی غلط فہمی کا اندازہ ہونے لگا ہے۔ انہیں اپنے پچھلے نظریات سے ہٹانا بہت مشکل نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ مادی ذہنیت کا تسلّط

ابھی اُن اثرات کا ذکر تھا جو روش تجربی نے علماءِ طبیعی کے طرزِ تفکّر پر ڈالے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ موجودہ تمدنی زندگی نے عوام الناس کے ذہنوں کو کن سانچوں میں ڈھالا۔

آخری علمی و صنعتی انقلاب کے بعد اجتماعی زندگی نے بالکل نئی صورت اختیار کر لی۔ صنعتی دنیا میں ہر چیز مادی علل و اسباب کے قوانین اور خالص علمی خشک فارمولوں کی روشنی میں نظر کی جاتی ہے۔ کارخانوں اور فیکٹریوں کی فضا میں خلوص، بے لوثی

نوع پروری، ایثار و قربانی جیسے تمام انسانی احساسات و جذبات کی بابت کوئی بات چیت نہیں ہوتی ہے۔ موجودہ تمدنی زندگی میں بھی ہر چیز کو مادی منافع کی ترازو میں تولا جاتا ہے۔ تمام اجتماعی شعبوں پر مادی علّت و معلول کا دستور حکومت کرتا ہے۔ افراد و اشخاص کے اجتماعی تعلقات کی عمارت مادی روابط کی بنیاد پہ بلند کی جاتی ہے۔

آج کل کے تہذیب و تمدّن میں دوستی و دشمنی، رفاقت و عداوت، احترام و تحقیر، شہرت و گمنامی، خیر خواہی و بدخواہی، رضامندی و ناراضگی، جنگ و آشتی ہر چیز کا معیار مادی منفعت ہے گزشتہ سادہ فطری زندگی کے اثرات رفتہ رفتہ مٹ رہے ہیں اُن کی جگہ کو خود غرضی، مطلب پرستی، بے مروتی، ظاہر داری اور طوطا چشمی نے لے لیا ہے۔ کہیں اور کا ذکر گھریلو زندگی کا مخلصانہ ماحول جس کے گرد مہر و محبت طواف کیا کرتے تھے۔ موجودہ تہذیب و تمدّن نے بے کیف بنا دیا ہے۔ وہاں اب سرد مہری، بیگانگی اور افراتفری نظر آرہی ہے۔ ایک خاندان کے افراد کے درمیان اُن کے باہمی قرابت دارانہ تعلقات میں استواری ان کے مادی روابط کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

یورپین قوموں میں رشتہ داری کی حدیں ماں باپ اور اولاد سے آگے بہت کم بڑھتی ہیں۔ چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ یہاں تک کہ

بھائی اور بہن کو ایک دوسرے کے حالات کی خبر نہیں ہوتی انہیں ایک دوسرے کی خوشی و غم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ صلۂ رحم مہمان نوازی، دوست پروری کے الفاظ اُن کے یہاں بے معنی ہیں موجودہ تہذیب و تمدن کے ان منحوس نتائج کی روک تھام صرف اخلاقی تعلیمات اور مذہبی عقائد کر سکتے ہیں۔ وسیع پیمانہ پر باضابطہ دینی و اخلاقی تربیت کا بندوبست نہ ہونے کی بنا پر یہ منحوس نتائج عوام کے ذہنوں میں نفوذ و تاثیر کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ انہوں نے عام طور سے دماغوں کو بلند اخلاق اور انسانی جذبات کے راستہ سے ہٹا کر خود غرضی اور مطلب پرستی کی راہ پر لگا دیا ہے۔ مادی ذہنیت نے انسان کو اس منزل پر پہونچا دیا ہے کہ وہ اخلاقی و مذہبی تعلیمات کو نہ محض یہ کہ بیکار اور غیر ضروری سمجھنے لگا ہے بلکہ انہیں اپنی حقیقی ترقیوں سے مانع تصور کرتا ہے۔

"منٹسکیو" اپنی کتاب "روح تمدّن" میں مذہب کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہے منٹسکیو اس دور کا آدمی ہے جب قدیم تہذیب رخصت ہو رہی تھی اور جدید تمدّن رساں رساں اُس کا قائم مقام بن رہا تھا۔

" انسان اس لئے عالمِ وجود میں آیا ہے کہ اپنی زندگی باقی رکھنے کی خاطر غذائیں کھائے، کپڑے پہنے اور اپنے قومی

فرائض کو انجام دے۔ اس بنا پر اُس کے مذہب کو اس طرح نہ ہونا چاہیے جو انسان کو کائنات کے رموز و اسرار میں گھرے غور و فکر پہ آمادہ کر کے اُسے زندگی کی لذت اندوزیوں سے محروم کر دے ۔۔ مسلمان مجبور ہے کہ ہر شبانہ روز پانچ وقت کی نماز پڑھے۔ ان اوقات میں زندگی کی ہر چیز کو بھلا کر صرف اپنے معبود کو یاد رکھے ۔۔ اس صورت میں طبعاً مسلمانوں کو دوسرے جہان کے اسرار و رموز کی زیادہ فکر رہتی ہے۔ اور دینوی امور سے کوئی زیادہ تعلق نہیں رہ جاتا ہے۔" !!

منٹسکیو یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی پستی اور پس ماندگی کا حقیقی سبب اسلام ہے۔ ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ منٹسکیو کے اس انداز فکر کا خالق وہی جدید تہذیب و تمدن ہے جس نے اُس کے دماغ کو مادیت کے سانچہ میں بالکل ڈھال دیا ہے۔ وہ شخص جس کا شمار دور آخر کے بڑے فلاسفہ میں ہے خدا کی طرف توجہ اور عالم آخرت کی فکر کو زندگی کے تنزل و انحطاط کا سبب بتاتا ہے وہ باتیں جو اخلاق اور بلند انسانی احساسات کی مربی، جو روح بشری میں لطافت و پاکیزگی پیدا ہونے کا تنہا سبب، جو عالمگیر برادری اور تمام باہمی حقوق کی حقیقی محافظ، جو غیر جانبدار قانون سازی اور صحیح طور پر اس کے نفاذ کی ذمہ دار، جو پورے عالم انسانیت کے لئے

امن و امان اور مکمل سکون و اطمینان کا پیغام ہیں۔ انہیں زندگی کے تنزل کا باعث بتانا تعجب خیز ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایسے مشہور عظیم فلسفی کا عقیدہ ہے کہ انسان محض لذیذ غذائیں کھانے اور عمدہ قیمتی لباس پہننے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ یقیناً اجتماعی و قومی خدمات سے بھی اُس کی مراد اسی قسم کے خالص مادی امور ہیں۔ بلا شبہ انسانی ذہنی پر اس طرز تفکر کا تسلط مذہب و اخلاق کے اثرات کو بالکل نیست و نابود کر دیگا۔

۳۔ مذہبی رہنماؤں کی مجرمانہ روش

مذہب کی رہنمائی اور پیشوائی کا تعلق لباس اور پوشاک سے نہیں ہے، جو اُس کے حقائق و معارف کا علمی و عملی طور سے محافظ ہو وہی دینی رہنما ہے۔ ہر موجب اقتدار معزز منصب کے جھوٹے دعوے دار ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ مغربی ممالک میں مذہب کے وقار و اثر کو گھٹانے کی ذمہ داری اُن نمائشی دینداروں پر بھی ہے جنہوں نے بہت سے موہومات اور خرافات کو مذہبی عقائد کا جزء قرار دے دیا۔ ان نادان، تنگ نظر، خود غرض دنیا پرستوں نے خدائی پیغامبروں کے مضبوط، مطابق فطرت دستور زندگی کو بالکل بدل کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ عوام میں اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ مذہب کے صحیح تعلیمات کو اضافہ شدہ موہومات و خرافات سے الگ کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور سے مذہب کو غیر منطقی اور

غیر علمی چیز سمجھا جانے لگا۔ مادہ پرستوں کے ایک گروہ کمیونسٹوں نے یہاں تک جرأت کی کہ کھلم کھلا اعلان کر دیا "ہر مذہب غیر علمی ہے"۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمیونسٹوں کا تمام مذاہب سے اعلانِ بغاوت علم و مذہب کے درمیان مخالفت پر مبنی نہیں ہے۔ اس بغاوت کے کچھ سیاسی اسباب ہیں جو باخبر افراد کے پیش نظر ہیں۔ تاہم انہیں اس جرأت و جسارت کا موقع انہی موہومات و خرافات کی بدولت ملا جن کا اضافہ معارف دینی سے ناواقف مذہب کے نمائشی پیشواؤں نے کر دیا تھا۔

نام نہاد مسیحی رہنماؤں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے دینی اثر و اقتدار سے غلط فائدہ اٹھا کر ایسی ایسی غیر انسانی حرکتیں کیں جنہوں نے عوام کو مذہب سے اور زیادہ بدظن بنا دیا۔ قرون وسطی کے پوپ اور پادری حیوانیت و درندگی کا کامل ترین نمونہ بنے ہوئے تھے۔ کتاب "روح قوانین" کے مترجم کا بیان ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں ان کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ ملکی امور ان کے آراء و افکار کے مطابق انجام پانے لگے تھے۔

قرون وسطی میں عوام کے سروں پر دو حکومتیں مسلط تھیں۔

ایک طرف پوپ کی روحانی حکومت اور دوسری طرف شہنشاہ وقت کی مادی حکومت۔ عوام ان دونوں سلطنتوں کے خراج گزار اور فرماں بردار تھے۔ عموماً مذہبی رہنماؤں کی طاقت بادشاہوں سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ وہ فتاوائے تکفیر کے ہتھیاروں سے سلاطین وقت کا کامیاب مقابلہ کر سکتے بلکہ اُن کے سروں کو اپنے قدموں پر جھکوا سکتے تھے۔

"داستانِ بشر" کا مصنّف "وان لون" گیارہویں صدی کے مقتدر مذہبی پیشوا "گریگوار ہفتم" اور شہنشاہِ وقت ہنری چہارم' کے باہمی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"جب یہ نزاع اپنے نقطۂ شباب پر پہونچی تو پوپ نے بادشاہ کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا اور شہزادوں کو اس کی مخالفت پر ابھار دیا۔ شہنشاہ نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے طے کیا کہ مجھے فوراً پوپ سے صلح کر لینا چاہیے۔ اس غرض سے وہ کڑا کے کی سردیوں میں "آلپ" کے پہاڑوں کو طے کرتا ہوا پوپ کی جائے قیام شہر "کانوسا" کی طرف تیزی سے روانہ ہوا۔ اس وقت بادشاہ کے جسم پر فقیرانہ تارک الدنیا تائبوں کا مخصوص لباس تھا۔ مسلسل تین روز شہر پناہ کے دروازے پر آسمان سے گرتی ہوئی برف کے نیچے انتظار کے بعد

بادشاہ کو شہر میں داخل ہونے اور پوپ کی خدمت میں
باریابی کی اجازت ملی۔ طویل عذر معذرت کے بعد بالآخر
پوپ نے بادشاہ کی خطاؤں سے درگزر کیا"

اس واقعہ سے قرون وسطیٰ میں مسیحی پیشواؤں کے اقتدار و اختیار کے حدود کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے اپنے اس غیر معمولی اثر و رسوخ سے کیا فائدے اٹھائے۔ انہوں نے اپنی طاقت کو مذہب کی تقویت میں صرف کیا یا اُسے کمزور کرنے میں۔ موقع نہیں کہ اُن تمام کارگزاریوں کو پیش کیا جائے۔ اُن کے صرف ایک کارنامہ کے تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

محکمہ تفتیش عقائد

یہ محکمہ جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے لوگوں کے عقائد کی چھان بین اور مخالف مسیحیت افکار کی تحقیق کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس کو عجیب و غریب اختیارات دے دئے گئے تھے۔ ان محکموں کی پیدائش بارھویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ مورخین کے بیان کے مطابق سب سے پہلا اس قسم کا محکمہ اٹلی کے ایک شہر "ورون" میں قائم ہوا۔ پادریوں کو اس موقع پر ہدایت کی گئی کہ مخالفین مسیحیت کو عیسائیت کے دائرہ میں لانے کی کوشش کریں۔ ۱۲۳۳ء میں "گریگوار نہم" نے ایک مسیحی مشن کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد مسیحیت کے

مخالف عقائد و نظریات کی تردید تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اٹلی اور اسپین کے تمام بڑے بڑے مقامات پر تفتیش عقائد کے محکموں کا ایک جال بچھ گیا جس کا سلسلہ انیسویں صدی کے اوائل تک باقی رہا۔

یہ محکمے پوپ اور پادریوں کے لئے اپنے دشمنوں سے انتقامی کارروائیوں کا بڑا خوبصورت وسیلہ بن گئے۔ انہوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنے مخالفوں کو دل کھول کر تباہ و برباد کیا۔ وہ بڑی سہولت سے بغاوت مذہب کا الزام عائد کر کے ان کے لئے سزائے موت کا حکم صادر کرتے تھے۔

سات سو سال کی طولانی مدت میں ان مسیحیت کے جھوٹے حامیوں کی مجرمانہ روش کے ہاتھوں جو افسوسناک مظالم انسانیت پر ہوئے انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اجمالاً اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ مظلوم جنہیں تفتیش عقائد کے سلسلہ میں زندہ جلا دیا گیا تھا یا قید خانوں میں ڈال کر جن کا گلا گھونٹ دیا گیا اُن کی تعداد پچاس لاکھ سے کم نہ تھی مورخین کا بیان ہے کہ یہی محکمے تقریباً سات سو برس تک یورپ میں انسانی خون کی ندیاں بہاتے رہے۔ ان ظالمانہ محکموں کا عجیب و غریب دنیا سے نرالا دستور تھا۔ جس کے خلاف شکایت کر دی جاتی تھی وہی ان کے نزدیک مجرم بن جاتا تھا۔ اپنی بے گناہی کا اثبات اس کا فریضہ تھا۔ مگر اس کے خلاف تو ہر قسم کی گواہی دستیاب

اور قابلِ قبول تھی۔ لیکن اس کی موافقت میں شہادت دینا بہت مشکل اور خطرناک تھا۔ یہودیوں، نوکروں، غلاموں تک کو حق تھا کہ مجرم کے خلاف شہادت دیں مگر اس کی موافقت میں یہ لوگ گواہی نہیں دے سکتے تھے۔ ان محکموں کا مستقل اصول گویا یہ تھا کہ ایک واقعی مجرم سزا پانے سے بچنے نہ پائے اگرچہ شک میں ہزار بے گناہوں کا خون بہا دیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ اقتدار انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ بدترین کاموں کو اس کی نظر میں صحیح و مستحسن بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہ بھی قابل توجہ بات ہے کہ یہ محکمے کبھی کسی کے لئے سزائے موت کا فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ کلیسا خون ریزی سے سخت بیزار تھا وہ کسی کے خون میں ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا تھا۔ مذہبی عدالتیں صرف تکفیر و الحاد کا حکم دیتی تھیں۔ اس کے بعد مجرم کو غیر مذہبی محکموں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ سزائے موت کا حکم وہ سناتے تھے۔

پوپ اور پادری یہ سلوک صرف دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی اس مجرمانہ روش کا شکار بہت سے مسیحی افراد بالخصوص علوم طبیعی کے ماہرین و محققین بھی ہوئے۔ نہایت بے رحمی اور سفاکی سے ان کی زندگی کا خاتمہ کیا گیا۔

اہل کلیسہ کا برتاؤ اتنا سخت اور ظالمانہ تھا کہ بعض اوقات ان کے پکے کٹر مرید تک اُن کے نقطہ نظر سے اختلاف کر بیٹھتے تھے جس وقت اسپین پر عیسائیوں کا تسلّط قائم ہوا تو وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں دو نظریے پیش کئے گئے۔

پادریوں کا خیال تھا کہ تمام مسلمانوں کو بلا استثناء مرد، عورت، بوڑھے، جوان یہاں تک کہ دودھ پیتے بچوں کو بھی قتل کر دیا جائے ان کے مقابلہ میں عیسائی عوام نے حکومت سے خواہش کی کہ سارے مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال دیا جائے۔

بادشاہ وقت "فلیپ دوم" نے دونوں جماعتوں کی رائے پر عمل کرنے کے لئے درمیانی راستہ کو اختیار کیا۔ اُس نے ۱۶۱۰ء میں حکم دیا کہ تمام مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال دیا جائے اس قانون میں بادشاہ نے کچھ ایسے شرائط و قیود رکھ دیئے کہ تین حصہ مسلمان ملک بدر ہونے سے پہلے مار ڈالے گئے۔

(تاریخ تمدّن)

پوپ اور پادری اپنی معاندانہ روش کی بدولت اس زمانہ میں علوم طبیعی کے ماہرین کے مقابل صف بستہ نظر آرہے تھے۔ تمام جدید علمی نظریات خواہ وہ کتنے ہی مضبوط اور منطقی دلائل پر مبنی ہوں اُن کے لئے ناقابلِ قبول تھے۔ ہر وہ خیال کہ جو اُس زمانہ کے عوام کے افکار و تصورات کے خلاف ہو مذہبی طبقہ کے نزدیک،

آئین و اصول مسیحیت سے کھلی ہوئی بغاوت اور کفر و ارتداد کا مترادف تھا۔ لہٰذا جدید علمی تحقیقات کے جرم میں بہت سے روشن دماغ مفکرین کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور بہت سے سوختہ بخت زندہ نذرِ آتش کر دئے گئے۔

اس طویل و عظیم کشت و خون اور کھلم کھلا علوم و فنون کی ترقیوں سے عناد و اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے خطا مسیحیت کے دامن پر دو بدنما دھبے لگ گئے۔ ایک یہ کہ وہ ظالم، سفاک، انسانیت دشمن مذہب ہے اور دوسرے یہ کہ علم و فن کے عروج سے اُس کو عناد ہے۔ ان میں سے ہر بات عوام کو مذہب سے برگشتہ و متنفر بنانے اور دشمنانِ دین کے معاندانہ پروپیگنڈے کو تقویت پہونچانے کے لئے کافی تھی۔

علم و فن کی ترقیاں سیلاب کے مانند ہیں۔ انہیں کوئی مادی و روحانی اقتدار پابند نہیں بنا سکتا۔ فطرت کے تقاضے روکے سے رک نہیں سکتے۔ شدید مزاحمتوں کے باوجود یورپ میں تدریجی طور پر علوم و فنون کو برابر عروج حاصل ہوتا رہا۔ اہلِ کلیسہ کے غلط رویہ نے چونکہ مذہب کو علم کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا تھا لہٰذا علوم جتنا جتنا آگے بڑھتے گئے مذہب اتنا اتنا پیچھے ہٹتا گیا۔ دوسری واضح تر لفظوں میں دینی رہنماؤں نے چونکہ مذہب کو علم و فن کی مخالفت کے رنگ میں رنگ دیا لہٰذا تمام علمی ترقیاں مذہبی افکار

و تعلیمات کے خلاف خود بخود بہترین خاموش مؤثر مبلغ بن گئیں۔

آج کل بھی یورپ کے مادیین کی تحریروں اور تقریروں میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ وہ ہر جگہ مذہب اور علم کو ایک دوسرے کی مقابل ضد قرار دیتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے اور لکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہبی عقیدہ کا یہ تقاضہ ہے لیکن علمی تحقیق کا فیصلہ اس طرح ہے۔

مسیحی رہنماؤں کے غیر ذمہ دارانہ اور غیر دانشمندانہ طرز عمل کا انتہائی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تمام ادیان عالم اور تمام مذہبی عقائد و افکار کو عام طور سے مسیحیت کی طرح غیر علمی سمجھ لیا گیا۔ یہ غلط نامعقول اور بے احتیاطی پر مبنی نظریہ ایک قیمتی سوغات کی طرح یورپ کے دروازوں سے مشرق میں لایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو جو منبع علوم و فنون اور جدید علمی و تحقیقی عمارت کا بنیادگزار تھا۔ مسخ شدہ مسیحیت و عیسائیت کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا گیا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ یورپ کے پوپ اور پادریوں کی طرح مشرق میں تنگ نظر جھوٹے مذہبی رہنما نہیں ملیں گے۔ ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ قانون اسلام یہودی اور مسیحی اہل ذمہ تک کی حمایت کرتا ہے۔ اسلام نے اُن تمام علوم و فنون کے نشوونما کی نہ صرف اجازت دی ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ وہ برابر اُن کی پشت پناہی اور سرپرستی

کرتا رہا ہے اس نے ہر زمانہ میں واجب قرار دیا ہے کہ کچھ افراد انہیں حاصل کر کے دوسروں کی ضرورتیں پوری کریں۔
ممکن ہے اس کو محض ہمارا دعویٰ سمجھا جائے ۔ اسلام اور مسیحیت کے درمیان اس تفرقہ کو بسہولت نہ مانا جائے ۔ واقعاً یہ ہمارا خشک مذہبی تعصب نہیں بلکہ ایسی پختہ ناقابل انکار حقیقت ہے جس کا غیر مبہم فیصلہ تاریخ کر دیتی ہے ۔ مسیحیت اور مسیحی رہنماؤں کی صف میں اسلام اور علمائے اسلام کو کھڑا کرنا بڑی ناانصافی اور تاریخی بد دیانتی ہے۔

اسلام اور مسیحیت کا سرسری موازنہ

"وان لون" جو عیسائی علماء میں سے اور ہالینڈ کے مسیحی ماحول کا پروردہ یافتہ شخص ہے اپنی کتاب میں لکھتا ہے :-

بیچارے "گلیلو" نے بے احتیاطی کی کہ ایک چھوٹی سی مضحکہ خیز دوربین سے ستاروں کا معائنہ کر ڈالا۔ اس سے بھی بدتر یہ غلطی کی کہ حرکت زمین اور سیارات کے بارے میں ایسے نظریات ظاہر کر دئیے جو کیتھولک عیسائیوں کے مسلمہ اصولوں کے بالکل مخالف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے جیل میں ڈال دیا گیا —— پروٹسٹنٹ بھی تعصب اور علوم و فنون سے دشمنی میں کیتھولک

سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ ہر شخص جو کسی بات کی تحقیق اور کسی چیز کے انکشاف میں کوشش کرے ان کے نزدیک نوعِ بشر کا خطرناک ترین دشمن تھا"!

فرانسیسی مؤرخ "گوستا ولوبون" لکھتا ہے:۔

"دورانِ خون کے انکشاف کو پورے ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی اسپین کے اطباء جن کی تربیت خالص عیسائیت کے ماحول میں ہو رہی تھی بالکل اس مسئلہ سے بے خبر تھے"۔

پھر اپنی کتاب کی پانچویں جلد میں لکھتا ہے۔

"دسویں صدی عیسوی میں ایک مسیحی پوپ نے فارغ التحصیل ہوکر اور اپنی تکمیل علمی کرنے کے بعد اپنے بعض تحقیقات کو شائع کرنا چاہا تو ہر طرف سے حیرت و تعجب کا اظہار کیا گیا۔ مذہبی حلقوں نے فیصلہ کر دیا کہ شیطان اس کے جسم میں حلول کر گیا ہے اور وہ خداوند مسیح کے دین سے خارج ہو گیا ہے"

ان تاریخی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے پوپ اور پادریوں کو علوم و فنون سے کتنا بیر تھا۔ مذہبی طبقے جدید علمی تحقیقات کے بری طرح مخالف تھے۔ مناسب ہے کہ اب انہی عیسائی مؤرخین کی زبانی علم و فن کی بابت اسلام اور مسلمانوں

کے خیال اور ان کے رویہ کے متعلق تصریحات سنئے اور پھر مسیحیت و اسلام، علماء نصاریٰ اور علماء مسلمین کے درمیان موازنہ فرمائیے۔

جرجی زیدان اسلامی تمدن کے علوم وفنون میں اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"جونہی اسلامی تمدن اپنے شباب پر پہونچا اور جدید علوم مسلمانوں کے درمیان پھیلے خود مسلمانوں میں ان علوم کے ایسے ایسے ماہرین پیدا ہو گئے جو بہت سے مواقع پر اپنے تحقیقات و نظریات کے لحاظ سے اصل موجدین سے بلند و بالاتر نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے تحقیقات کی بدولت ان علوم وفنون میں خاص تازگی و رنگینی پیدا ہو گئی۔ اسی لئے جب یورپ والے یونانی علوم سے استفادہ کی غرض سے اٹھے تو انہیں مجبوراً ان کا اقتباس عربی زبان سے کرنا پڑا جس میں یونانی فکر کے ساتھ اسلامی فکر کی آمیزش ہو چکی تھی۔"

"گوستا و لوبون" نے بھی جرجی زیدان سے ملتی جلتی عبارت لکھی ہے:-

"اسلامی تمدن نے مشرق و مغرب میں یکساں طور سے اثر کیا یورپ اسی کی وجہ سے متمدن ہو گیا۔ اسلامی تمدن کے اثرات علوم وفنون، اخلاق و ادبیات کے سلسلہ میں غیر محدود

اور بے شمار ہیں۔"

یورپین عالم" ماجور اثور بیونرد" صاف لفظوں میں اعتراف کرتا ہے:۔

" اگر اسلامی تمدن و تہذیب اور اس کے علوم و فنون، ہدایات و تعلیمات نہ ہوتے۔ تو مغربی قومیں موجودہ ترقی یافتہ حالت میں نظر نہ آتیں بلکہ ہمیشہ جہالت و وحشت میں مبتلا رہتیں۔"

جینوا یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر" ادوارنیتہ" نے تصریح کی ہے:۔

" قرون وسطیٰ میں جب کہ سارے یورپ کے اوپر جہالت و بربریت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی تو عربوں کے درمیان اسلامی تمدّن و تہذیب کا آفتاب پوری آب و تاب سے چمکا جسے اس دور میں نشان ہدایت و ترقی سمجھا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل مغرب نے یونانیوں کے علوم و معارف کو عربوں کے توسط سے حاصل کیا۔"

مشہور فرانسیسی عالم" رنان" کا کہنا ہے:۔

" یہی نہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں نے عظیم فلاسفہ و مفکرین پیدا کئے بلکہ ان کے متعلق یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ان کا افق عقل و فکر، یورپ کا کیا ذکر

سارے عالم سے بلند و ممتاز تھا۔ اس کی مضبوط ترین دلیل تاریخ کا وہ بے مثال سنہری علمی و فنی زمانہ ہے جس میں مسلمانوں نے ایران، اسپین، ہندوستان پر حکومت کی۔ مسلمانوں نے اپنے اس دورِ حکومت میں عقل و فکر کی وہ زندہ نشانیاں قائم کر دیں جنہوں نے یہ بات بالکل صاف کر دی کہ عقلِ بشری کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لحاظ سے اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے۔"

حکومت فرانس کے وزیر شہرہ آفاق عالم "روزی" نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:۔

"جب کہ اہلِ مغرب جہالت کی تاریکیوں میں حیران و سرگردان تھے۔ مسلمانوں نے علوم و فنون کا زبردست چراغ روشن کیا اور ادب، فلسفہ، صنعت و حرفت میں عالمِ بشریت کی قیادت کی۔"

مشہور و معروف فرانسیسی عالم "سدیو" اپنی تاریخ میں رقم طراز ہے:۔

"رسولِ اسلام نے اپنے ظہور کے بعد تمام قبائل عرب کو جمع کر کے ایک قوم بنائی جس کا ایک مقصدِ زندگی قرار دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم طاقت ور قوم وجود میں آ گئی جس کی حکومت ہندوستان سے اسپین تک پھیلی ہوئی

تھی جس نے تمام عالم انسانیت کے درمیان تہذیب و تمدن کا جھنڈا اس وقت تک بلند کیا جب یورپ میں ہر طرف جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔"

"رینو نبورت" نے اپنی کتاب میں اقرار کیا ہے:۔

"ہم پر اس حقیقت کا اعتراف واجب ہے کہ تمام علوم و فنون، طبیعات، فلکیات، فلسفہ، ریاضیات جو دسویں صدی عیسوی میں اہل یورپ کے درمیان پھیلے اسلام اور قرآن سے ماخوذ ہیں بلکہ یورپ کو اس اعتبار سے مسلمانوں کا ایک شہر سمجھنا چاہیے۔" کتاب "میراث اسلام" کے ایک حصہ کے مؤلف "ارنسٹ بارکر" نے یورپ کی علمی تحریک میں مسلمانوں کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے "پرونز" کا قول نقل کیا ہے کہ "یورپ کی تمام ترقیوں کا اصلی سبب صلیبی جنگیں تھیں۔ یورپ میں اصلاح و انکشاف کا دور انہی جنگوں سے شروع ہوتا ہے۔"

"ماکس میرہوف" لکھتا ہے:۔

"اسلامی و مشرقی علوم باران رحمت بن کر یورپ کی خشک سرزمینوں پر برسے اور انہیں سبز و شاداب کر گئے۔"

یقین کرنا چاہیے کہ ان عبارتوں میں مورخین نے مبالغہ آمیزی بالکل نہیں کی ہے۔ پھر مسیحی تاریخ دانوں کو اسلام کی حمایت میں

مبالغہ پر کیا چیز آمادہ کر سکتی ہے۔ مزید اطمینان کے لئے مسلمانوں کی علمی کارگزاریوں کی ایک مختصر فہرست پیش کی جاتی ہے۔ نیز یہ بتایا جائے گا کہ یورپ نے اپنی موجودہ علمی ترقیوں میں علوم اسلامی سے کیونکر فائدہ اٹھائے۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مسلمان جب علم وفن کی راہوں پر چلنے کے لئے تیار ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے ایسے علوم وفنون کی طرف توجہ کی جو انہیں ضروریات زندگی کی فراہمی میں سہارا دیں اور ان کے دینی فرائض کی انجام دہی میں مدد کریں۔ مذہب ان کی زندگی میں ضمنی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ انہوں نے اس کی بنیادوں پر زندگی کی پوری عمارت بلند کی تھی۔

مسلمانوں نے علم حساب اصول اسلام کے مطابق میراث تقسیم کرنے کے لئے، علم ہندسہ، سمت قبلہ اور حج کے راستے معلوم کرنے کی خاطر فلکیات کو نمازوں کے صحیح اوقات معین کرنے کے واسطے سیکھا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف علوم وفنون میں مسلمانوں کی توجہ کا اصلی محرک مذہب تھا۔ اسلام اور "رینسانس" کی علمی وفنی تحریکوں میں یہی بنیادی فرق نظر آتا ہے۔ "رینسانس" کی علمی تحریک کے پس منظر میں دنیا طلبی اور اسلام کی علمی تحریک کے پس پشت دین خواہی کا جذبہ کارفرما تھا۔

یہ پس منظر رہنا چاہیے کہ ہم اس کا دعویٰ ہرگز نہیں کرنا چاہتے

کہ علوم طبیعی و ریاضی کے مسلمان ماہرین سب یا اکثر مذہبی و روحانی پیشوا تھے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا بتانا ہے کہ ان کی یہ علمی و فنی سرگرمیاں ایک ایسے ماحول میں تھیں جو خالص مذہبی و دینی تھا۔

۱۔ ۱۱۳۰ء میں اسپین کے ایک شہر "طلیطلہ" میں دارالترجمہ قائم ہوا۔ تمام عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ شروع کیا گیا۔ ان ترجموں سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کتابوں نے اہلِ یورپ کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں علم و نور کی ایک دوسری دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا۔

اسلامی کتابوں کا لاطینی زبان میں اس کثرت سے ترجمہ ہوا کہ فقط "ڈاکٹر لک لرک" نے اپنی تاریخ طب میں تین سو کتابوں سے زیادہ کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ مشہور مسلمان عالم "یعقوب کندی" نے مختلف علوم و فنون میں کثرت سے کتابیں لکھیں جن کی تعداد واقعاً حیرت انگیز ہے۔

فلسفہ میں ۲۲ کتابیں، حساب میں ۱۱ کتابیں، ہندسہ میں ۲۳ کتابیں علم نجوم میں ۱۹ کتابیں، طبیعات میں ۳۳ کتابیں، کرویات میں ۸ کتابیں، منطق میں ۹ کتابیں۔

اس کے علاوہ بھی دوسرے موضوعات پر تالیفات موجود ہیں جن کی تعداد مجموعاً ۲۳۰ ہے۔

۳۔ جرجی زیدان کا کہنا ہے کہ یورپ والے خیال کرتے ہیں کہ علم اقتصاد سیاسی کو انہوں نے ایجاد کیا ہے۔ حالانکہ ایک ہزار برس پہلے فارابی نے اس موضوع پر کتاب لکھدی ہے۔

۴۔ مسلمانوں میں علم جغرافیہ کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے ہیں۔ نضر۔ اصطخری، ادریسی، قزوینی، یاقوت حموی، ابوالفدا، مقریزی کے نام اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی کتابیں مدتوں یورپ میں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔

۵۔ "پی یر روسو" نے اپنی کتاب "تاریخ علوم" میں لکھا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی سے علم طب سے اطباء اور عوام دونوں نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ عوام کے ذہنوں میں راسخ ہوگیا تھا کہ تمام امراض کے اصلی اسباب جنات کے اثرات ہیں۔ ان کے دفعیہ کے لئے وہ جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ سے مدد لینے لگے۔

علم طب احتضار کے عالم میں موت کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا کہ مسلمان علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے دنیائے علم طب کو ایسی رونق بخشی کہ اسپین کے ایک حصہ کاسٹیلہ کے بادشاہ کو جس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا علاج کے واسطے شہر قرطبہ اپنے دشمنوں کے پاس مجبوراً آنا پڑا۔

مؤلف "عبقریۃ العرب" کا بیان ہے کہ جس وقت مسلمان اطباء، ابن سینا اور محمد ابن زکریا وغیرہ صرع، خناق، سل اور امراض

چشم کا باقاعدہ علاج کر رہے تھے اہلِ یورپ کا خیال تھا کہ مرض صرع میں مبتلا اشخاص کے اجسام میں شیطان حلول کر جاتا ہے مریضوں کو صحت یاب کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ انہیں خوب پیٹنا چاہیے

ڈاکٹر عمر فرخ کے علاوہ "گوستا ولوبون" نے "تمدن اسلام و عرب" میں لکھا ہے کہ نویں اور دسویں صدی میں جب کہ اندلس اسلامی تہذیب و تمدن کے نور سے جگمگا رہا تھا ہم اہلِ یورپ کے یہاں علمی مرکز چند بد وضع و بد ہیئت قلعوں کا نام تھا۔ جن میں ہمارے امراء رؤسا، وحشت و حیوانیت کی زندگی بسر کر رہے تھے، انہیں اس پر فخر تھا کہ ہمیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔!!

اس زمانہ میں علم طب اتنی ترقی کر گیا تھا کہ ڈاکٹر مصطفوی کی تحقیق کے مطابق سرطان کے علاج اور اس کی علامتوں کے سلسلہ میں موجودہ علماء طب کے معلومات اور ابنِ سینا کے اطلاعات کے درمیان کوئی خاص تفاوت نظر نہیں آتا ہے۔ اسی دور میں محمد ابن زکریا رازی نے چیچک کے بارے میں ایسا تحقیقی رسالہ لکھا جو ان کی شاہکار تالیف سمجھا جاتا ہے۔

ابنِ سینا نے بعض بیماریوں کے متعدی ہونے کا انکشاف پانی میں کر لیا تھا۔ قانون شیخ اور ابوالقاسم زہراوی کی کتاب "التصریف" کو ان کتابوں میں بہت اہمیت حاصل ہے جن سے

یورپ نے علم طب کے سلسلہ میں بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ "التصریف" میں دوسرے خصوصیات کے علاوہ فن جراحی کا بھی بیان موجود تھا۔

محمد ابن زکریا رازی نے اپنی ایک عملی آزمائش کے ذریعہ بتایا کہ وہ امراض میں ہوا کے تاثیرات سے بے خبر نہیں ہیں۔ رازی سے خواہش کی گئی کہ وہ اسپتال کی تعمیر کے واسطے آب و ہوا کے لحاظ سے بغداد کا کوئی بہترین حصہ منتخب کر دیں۔ رازی نے شہر کے چند خطوں کا انتخاب کر کے ہر جگہ گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لٹکا دیا۔ جہاں گوشت سب سے دیر میں خراب ہوا وہاں اسپتال تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ علم طب میں یورپ کی اس پس ماندگی کو بہت زمانہ گزر گیا ہے۔ ابھی سولھویں صدی کی بات ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا یورپین ڈاکٹر "پاراسلس" انار سے دانت کی بیماریوں میں کام لیتا تھا۔ محض اس بنا پر کہ اس کے دانے انسان کے دانتوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کا کیا ذکر امراض کے علاج میں جھاڑ پھونک اور جادو ٹنک سے یورپ کا یہ مشہور ڈاکٹر مدد لیا کرتا تھا۔

"گوستاولوبون" نے اعتراف کیا ہے کہ پانچ چھ سو سال تک یورپ کی تمام درسگاہوں میں مسلمانوں کی تالیف کردہ

کتابوں کے ترجمے پڑھائے جاتے رہے۔ اہلِ یورپ کے تمام معلومات کا دارومدار مسلمانوں کے علوم کے اوپر تھا۔ علم طب کے سلسلہ میں مسلمانوں کے آثار ہمارے دور تک باقی رہ گئے ہیں۔

طب نے ممالک اسلامیہ میں اتنا عروج حاصل کرلیا تھا کہ صرف بغداد کے اندر مقتدر باللہ کے دورِ حکومت میں ۸۶۰ امیدواروں نے ڈاکٹری سارٹیفکیٹ لینے کے لئے امتحان دیا۔ یقیناً ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان مشہور اطباء کی بھی تھی جن کی لیاقت وقابلیت عوام یا بادشاہوں کے طبّی خدمات انجام دیتے رہنے کی وجہ سے مسلم ہو چکی تھی لہٰذا کسی مزید آزمائش و امتحان کی ضرورت نہ تھی۔ بلاشبہ اس وقت بغداد میں ایک ہزار سے کم طبیب نہیں تھے۔

۶۔ مورخین کا بیان ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں نے موجودہ طرز کے دواخانے کھولے۔ اس وقت بھی زبانوں پر بہت سی دواؤں اور پودوں کے وہی قدیم فارسی یا عربی نام آتے ہیں۔ اس سے زیادہ تعجب خیز یہ کہ بڑے بڑے عظیم الشان اسپتالوں کی بنیاد بھی مسلمانوں نے ڈالی۔ مورخین نے تصریح کی ہے کہ تیسری صدی ہجری تمام نہ ہونے پائی تھی کہ اکثر و بیشتر اسلامی شہروں میں اسپتال قائم ہو گئے تھے۔

سنہ ۳۶۵ھ میں عضد الدولہ دیلمی نے بغداد میں "دیلمی اسپتال" قائم کیا جس میں ۲۴ ڈاکٹر بیک وقت کام کرتے تھے۔ ان میں معمولی

طبیبوں کے علاوہ سرجن، آنکھوں اور کانوں کے ماہر معالج بھی تھے اس اسپتال کا رئیس اور مدیر اعلیٰ مشہور طبیب "ساعور" کو بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد اس عہدہ پر محمد ابن زکریا رازی کا تقرر ہوا جو اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی طبیب گزرے ہیں۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں نے آج کل کی طرح گشتی شفاخانے بھی قائم کر دیئے جو اونٹوں اور خچروں پر برابر اِدھر اُدھر گردش کیا کرتے تھے۔
سلطان محمد سلجوقی کی فوجی ڈسپنسری اتنی بڑی تھی جسے چالیس اونٹ گاڑیاں کھینچا کرتی تھیں۔

اب ذرا صحت و تندرستی کے سلسلہ میں اسلام کے زیر سرپرستی مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور طرز عمل کے مقابل مسیحیت کے زیر تسلط ملک اسپین کے عیسائی ڈاکٹروں کا نظریہ دیکھئے۔

"گوستا ولیوبون" لکھتا ہے:-

"اٹھارھویں صدی عیسوی میں جب کہ تمام علوم و فنون کے ساتھ علم طب کافی ترقی کر چکا تھا اسپین میں ایک عجیب غریب سوال اٹھا۔ چند حساس اور دانشمند لوگوں نے ڈرتے ڈرتے ذمہ دار حلقہ سے درخواست کی کہ شہر "ماذرید" کی گلیاں بیخانہ اور دوسری غلاظتوں سے بھر گئی ہیں۔ اگر انہیں صاف کر کے بیچارے راستہ چلنے والوں کی آسائش کا لحاظ کیا جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔ ڈاکٹروں کی جماعت

نے اس درخواست کی پُر زور مخالفت کی اور کہا کہ ہمارے آبا و اجداد نہایت عقلمند اور اصولِ زندگی سے باخبر تھے۔ انہوں نے انہی کثافتوں کے بیچ میں پوری زندگی بسر کی۔ ہم بھی اپنے اسلاف کی پیروی کر کے ان کثافتوں کے درمیان زندگی بسر کر سکتے ہیں، کیا پتہ کہ ان غلاظتوں کے راستوں سے ہٹا دینے کے بعد ہمارا کیا انجام ہو!!

۷۔ مسلمان علماء نے بہت سی کتابیں علم النبات میں تالیف کیں۔ انہی کتابوں میں سے ابن ابیطار کی وہ مشہور کتاب ہے جو مسلسل سفروں اور طویل تجربوں کے بعد علم النبات میں انہوں نے تالیف کی۔ اپنے موضوع میں اس کتاب کی اتنی اہمیت تھی کہ یورپ کی تمام طبی ترقیوں میں صاحبانِ فن نے اسی پر بھروسہ کیا۔ ابو حنیفہ دینوری نے بھی علم النبات میں ایک مفصل کتاب لکھی جس کی ساٹھ جلدیں ہیں۔

رشید الدین ابن صوری نے ایک دوسری کتاب "کتاب الادویۃ المفردۃ" تالیف کی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اتنا اہتمام کیا کہ تمام ضروری ساز و سامان سمیت ایک مصور کو بھی اپنے ساتھ لیا اور شام کے جنگلوں میں ایک مدت تک گھومتے رہے۔ تحقیق اور تجربہ کے بعد ہر پودے

کے خصوصیات کو اس کی طبعی شکل وصورت اور رنگ کے مطابق تصویر کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا۔ رشید الدین نے یہ کتاب بالکل اسی جدید طرز پہ تالیف کی جو آج کل کے تمام متمدن ملکوں میں رائج ہے۔

۸۔ کیمسٹری میں مسلمانوں کے کارناموں کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سب سے پہلے کیمیا گری کے مجنونانہ خیال کی پرزور رد مسلمانوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ ابتداءً شیخ بوعلی سینا اور کندی نے کیمیا گری کے تخیّل کی تردید کی۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس کا بڑا مذاق اڑایا ہے۔

مسلمانوں میں شاید سب سے پہلے خالد ابن یزید نے کیمسٹری میں تحقیق کرنا شروع کی۔ خازنی نے بہت سی رقیق وسیال چیزوں کا وزن معلوم کر لیا جو موجودہ تحقیقات سے مختلف نہیں ہے۔ ابوریحاں نے اپنے دو طریقوں سے اجسام کے مخصوص وزن کا پتہ چلایا۔ اور اس سلسلہ میں جو اعداد وشمار انھوں نے اپنے حساب سے قرار دئیے ان میں جدید علوم کی اس روز افزوں ترقی کے باوجود کوئی خاص تغیر وتبدل نہیں پیدا ہو سکا ہے۔

"ھلمیارد" کا قول ہے کہ کیمسٹری سے متعلق رازی کے آثار وتحقیقات میں ہمیں کوئی ایک نقطہ بھی مبہم اور غیر واضح نہیں ملتا۔ ان کے تمام نظریات کی بنیاد حقائق تجربی پر ہے۔

مواد کیمیائی کی ترتیب و درجہ بندی کے سلسلہ میں انہوں نے جو پہلے پہل کوشش کی ہمیں اس پر شکر گزار ہونا چاہئیے۔

سترھویں صدی عیسوی میں یورپ کے کیمسٹری کے بڑے بڑے عالم کیمیا گری کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے، انہیں یقین تھا کہ معمولی دھاتوں کو قیمتی دھاتوں کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں مسلمانوں نے کیمسٹری میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ وہ "بوراکس" کو طبعی و مصنوعی دو طریقوں سے تیار کر لیتے تھے۔

مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ کیمسٹری کی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا بلکہ اس علم میں خود بھی بہت سے اضافے کئیے، انہوں نے کیمسٹری کی نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیں۔ جن پر جدید انکشافات کی بنیاد رکھی گئی۔ اہلِ یورپ کو اقرار ہے کہ مندرجہ ذیل چیزوں کا مسلمانوں نے انکشاف کیا ہے۔

(۱) السیڈ سولفوریک (۲) السیڈ نیتریک (۳) ہیڈرو کلریک (۴) پوٹاس (۵) جوہر نشادر (۶) نمک نشادر (۷) نیترات دارثان (۸) کلرید سولفوریک (۹) تیزاب سلطانی (۱۰) تیزاب فاروق (۱۱) زاج سبز (۱۲) الکل (۱۳) زرنیخ (۱۴) قلیا وغیرہ

ڈاکٹر عمر فرخ لکھتے ہیں کہ بلاشبہ مشرق و مغرب میں جدید کیمسٹری کے مؤسس محمد ابن زکریا رازی ہیں۔" مجلہ دنیائے علم" کے مدیر

ڈاکٹر جلال مصطفوی کی تحقیق کے مطابق محمد ابن زکریا "بوراکس" سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ اس کے بالمقابل یورپ کے مشہور و معروف ماہرین علم کیمیا "بوفن" اور "لاووازیہ" سولھویں صدی عیسوی میں اس کے نکالنے سے بالکل بے خبر تھے، وہ اسے ایران سے خریدا کرتے تھے۔

"کامپومانس" نے صراحت کی ہے کہ اہل یورپ شروع شروع علم خواص الاجسام سے بالکل نابلد تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ ۱۷۷۶ء تک اسپین کے پورے ملک میں جہاں تمام و کمال مذہبی ماحول کا تسلط تھا ایک شخص بھی ایسا نہیں مل سکتا تھا جو معمولی دواؤں کو ترتیب دے کر کوئی چیز تیار کر سکے۔

بعض عیسائی مورخین نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ کتاب "نتائج التکمیل" کا ترجمہ سترھویں صدی میں فرانسیسی زبان میں ہوا اور ایک عرصہ تک یورپ میں اس کو ماخذ و مدرک سمجھا جاتا رہا یہ کتاب جابر ابن حیان کی تالیف ہے جو علم خواص الاجسام کے یگانہ روزگار مشہور اسلامی عالم تھے۔ ان کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں بھی کیا گیا ہے۔ انھوں نے علم کیمیا میں دو ہزار صفحہ کی ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ان کے مؤلفات کا ایک مجموعہ "مختارات من رسائل جابر ابن حیان" کے نام سے مصر میں ۱۹۳۵ء میں طبع ہوا ہے جس کی ضخامت ۵۵۵ صفحہ ہے

اس کی تصحیح مشہور مستشرق " پاول کراوس " نے کی ہے۔ یہ مجموعہ جابر ابن حیان کے ان بیس رسالوں پر مشتمل ہے جو قاہرہ، پیرس، برطانیہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

" جارج سارتن " جابر ابن حیان کی شخصیت سے اتنا مؤثر تھا کہ اس نے آٹھویں صدی عیسوی کا نام جس میں وہ بقید حیات تھے " جابر " قرار دے دیا۔

علوم و فنون اور ان کے نشو و ارتقار کے سلسلہ میں اسلام کا صحیح نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ جابر ابنِ حیان اپنے ان علمی مراتب کے با وجود مسلمان اور مسیحی مؤرخین کی تصریح کے مطابق رہنمائے اسلام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں میں سے تھے۔

مذہبی و غیر مذہبی تمام علوم و فنون میں امام جعفر صادق ؑ کے گراں قدر آثار موجود ہیں۔ آپ نے علم و فن کی جس وسیع پیمانہ پر تربیت فرمائی ہے ہر باخبر شخص اس سے پورے طور پر واقف ہے۔ آپ کے مدرسۂ تعلیم و تربیت کے دروازے ہر ایک کے واسطے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے تھے۔ چونکہ حضرت کی علمی جلالت اپنے اور پرائے ہر ایک کے نزدیک مسلم تھی لہٰذا ہر طرف سے شائقین علم و فضل آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ کوفہ، بصرہ، واسط، حجاز اور دوسرے مقامات نے ہر قبیلہ کے فہم و فراست میں نمایاں علم

دوست با مذاق افراد کو منتخب کر کے حضرت کی خدمت میں استفادہ کی غرض سے بھیجدیا۔ امامؑ کے حلقۂ درس میں بنی اسد، بنی ضبہ بنی حارث، بنی حسن، قریش، غنی، مخارق، طی، سلیم، غطفان، غفار، ازد، خزاعۃ، خثعم، مخزوم یہ اور ان کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے اشخاص نظر آتے ہیں۔ عرب ممالک کے علاوہ ایران بالخصوص شہر قم سے بہت سے لوگ سفر کر کے امام کی خدمت میں آئے۔ اور آپ کے مدرسۂ تربیت و تعلیم میں داخل ہوئے۔

اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ چار ہزار آدمی ایک وقت میں امام علیہ السلام کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ معمولی شخصیت کے افراد نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء و محدثین تھے جو بعد کو مختلف علوم و فنون کے امام مانے گئے۔ انہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بڑی بڑی تعلیم گاہیں اور علمی مجلسیں قائم کیں۔ ان میں سب سے بڑی علمی مجلس مسجد کوفہ میں قائم ہوئی جس کے متعلق حسن ابن علی وشاء کا بیان ہے کہ اس سے استفادہ کر کے نوسو آدمی مسلم الثبوت عالم و محدث قرار پائے جن میں سے ہر ایک امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتا تھا۔

امامؑ کے علمی فیوض کی بدولت تمام اسلامی مرکزوں میں علم و فن کے چرچے ہونے لگے۔ جسٹس امیر علی نے اپنی کتاب تاریخ العرب

یں لکھا ہے:۔

"اس امر پر اتفاق ہے کہ اس وقت علم کی نشر و اشاعت نے فکر انسانی کو آزاد کرنے میں مدد کی ہر اسلامی اجتماع میں علمی و فنی موضوعات پہ بحثیں ہونے لگیں۔ اس علمی تحریک کے قائد وزعیم علی ابن ابی طالبؑ کے پوتے امام جعفر صادقؑ تھے۔ آپ کا فکری و عقلی افق بہت بلند اور وسیع تھا۔ آپ نے اپنے زمانہ کے تمام علوم کی طرف توجہ فرمائی۔ اسلام کے مشہور علمی و فلسفی مکاتب کا آپ کو بانی سمجھا جاتا ہے۔ حضرت کے حلقۂ درس میں صرف وہی لوگ نہیں شامل تھے جو بعد میں بعض مستقل مذاہب کے مؤسس بن گئے۔ بلکہ دور دراز مقامات کے رہنے والے طلاب فلسفہ نے بھی آپ سے مکمل استفادہ کیا۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جہاں اپنے منصبی فرائض کے طور پر فقہ اسلامی، تفسیر قرآن مجید اور عام اخلاقی تربیت کی طرف خاص توجہ فرمائی وہاں آپ کی ذات سے دوسرے علوم و فنون طب کیمیا، علم حیوان، علم النبات وغیرہ میں بھی دنیا کو استفادہ کا موقع ملا۔

آپ کی مجلس درس سے فیض یاب ہو کر آپ کے اصحاب تلامذہ نے تمام علوم و فنون میں کتابیں لکھیں۔ ابان ابن تغلب، مفضل ابن عمر

جابر ابن حیان، زرارہ، ابوبصیر، محمد ابن مسلم، اسماعیل ابن ابی خالد وغیرہ کے تالیفات با اطلاع افراد کے پیش نظر ہیں۔ صاحب "ذکری" نے ان تالیفات کی تعداد چار سو لکھی ہے۔ صاحب "الذریعۃ" نے محض علم حدیث میں دو سو مؤلفات کا ذکر کیا ہے۔

علوم و فنون کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ خاص انہماک ان کے نشو و ارتقاء کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی سرپرستی میں ساری علمی و فنی ترقیاں کی ہیں۔ اسلام نے انسانی عقل کو تمام مفید علوم و فنون کے میدانوں میں جولانی کی اجازت دی ہے۔ اسے عقل کی کارگزاری پر پابندی ہی عائد کرنا ہوتی تو وہ دنیا کو غور و فکر کی دعوت نہ دیتا۔ اسلام عقلی و فکری صلاحیتوں پر پہرے نہیں بٹھاتا۔ وہ عقل کو مذہب کا دشمن نہیں بلکہ سچا ہمدرد سمجھتا ہے۔ وہ قرآنی تعلیمات کو صاحبان عقل کا رہنما بتلاتا ہے ان فی ہذہ تبصرۃ و ذکری لاولی الالباب۔ وہ عقل شعور سے کام نہ لینے والوں کو جانوروں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل سبیلا۔ اسلام صاف اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ روز قیامت اندھے محشور ہوں گے۔ ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ۔ وہ افکار و عقول کو کائنات کے اسرار و رموز میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے قل انظروا ماذا فی السموات و الارض۔

اگر کوئی شخص علمی مشغولیت سے الگ رہ کر محراب عبادت میں پوری زندگی گزار دے تو وہ اسلام کی نظر میں بہت زیادہ مدح کا مستحق نہیں ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے۔ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم۔ یہی نہیں بلکہ اس نے علمی و عقلی میدانوں میں انسان کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے اعلان کر دیا کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ۔ ہر مسلمان مرد و عورت کو علم حاصل کرنا چاہیے۔

علم و فن کی طرف انہی توجہ دہانیوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان دینی و دنیوی علوم و فنون میں حیرت انگیز رفتار سے آگے بڑھے۔ اسلام انسان کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کے ساتھ اس کے دنیوی امور کی بھی پوری پوری نگرانی کرتا ہے۔ اسلام انسان کو دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے معراج کمال پر پہونچانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے زیر سرپرستی خالص دنیاوی فنون میں بھی نوع انسانی کی سربراہی کی ہے۔

۹۔ ڈاکٹر عمر فرخ نے اپنی کتاب "عبقریۃ العرب" میں لکھا ہے کہ دنیائے علم و فن کو علم حساب کے سلسلہ میں محمد ابن موسی خوارزمی کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس میں بہترین تحقیقات اور اضافے کئے۔ اسلام سے پہلے دنیا صرف کسر اعشاری تک حساب جانتی تھی۔ مسلمانوں نے علم حساب کو

ترقی دی۔ یہاں تک کہ کلمۂ "صفر" کو انہوں نے ایجاد کیا۔ تمام قوموں نے یہ لفظ مسلمانوں سے سیکھی ہے۔ انگریزی، جرمنی فرانسیسی وغیرہ نے یہ کلمہ عربی زبان سے لیا ہے۔

غیاث الدین کاشی نویں صدی کے مشہور ریاضی دان نے محیط دائرہ اور اس کے قطر کے درمیان ۲ ۳ ۷ ۸ ۹ ۵ ۳ ۵ ۶ ۲ ۹ ۵ ۱ ۳/۱۴ نسبت قرار دی۔ یہ نسبت یورپین ریاضی دانوں کی معلوم کی ہوئی نسبت ۳/۱۴۱۵۹ سے بہت زیادہ دقیق ہے۔

۱۰۔ علم جبر کا وجود مسلمانوں کے پہلے سے ہے لیکن اسے اُس زمانہ میں کسی دوسرے نام سے یاد کرتے تھے اس علم کا نام "جبر" محمد ابن موسیٰ خوارزمی نے قرار دیا ہے۔ خوارزمی نے اس علم میں سب سے پہلی کتاب مامون خلیفہ عباسی کی فرمائش سے تالیف کی۔

"پلی بررسو" کے نزدیک علم جبر نے اس کتاب کی بدولت نشو و ارتقار کا ایک عظیم مرحلہ طے کیا۔ مسلمانوں سے پہلے معادلات درجہ ۲ کو حل کر لیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے معادلات سہ مجہولہ و چار مجہولہ کو بھی حل کر لیا۔ صاحب عبقریۃ العرب کا خیال ہے کہ یہ علم جبر کے کمال کا آخری مرتبہ ہے کیونکہ جن معاملات میں مجہولات زیادہ ہوں وہ بطریق جبر حل نہیں کئے جا سکتے بلکہ انہیں دوسرے راستوں سے حل کرنا چاہیے۔ "عبقریۃ العرب" کے مؤلف نے

یہ بھی لکھا ہے کہ "عدد ملعب" کے مجموعہ کے سلسلہ میں جو نظریہ "پی یر ڈفرماٹ" کے نام سے مشہور ہے اس کی بنیاد مسلمانوں کے ہاتھوں نے ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مسلمانوں ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے جبر و ہندسہ کی آمیزش سے "ڈکارٹ" کے ہندسۂ تحلیلی کے اصول کو پیدا کیا۔

۱۱۔ یہ حقیقت ہے کہ یونانیوں نے علم ہندسہ میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اس میں ایسی ایسی نئی باتیں پیدا کیں جو ان کی جودت طبع کی زندہ و پائندہ دلیلیں ہیں۔ مسلمانوں کے نامور عالم محقق طوسی ہی کے اصولِ ہندسۂ سطحیہ کی اصل پنجم پر "سر لانو ساکچری" نے اٹھارویں صدی میں ہندسۂ فضائی کی عمارت تیار کی۔

مسلمانوں کی سربلندی کے لئے یہ کافی ہے کہ اہلِ یورپ نے علم ہندسہ ان کی کتابوں سے سیکھا ہے۔ "مثلثات" کو بھی اسلامی علم قرار دینا چاہئے۔ مسلمانوں سے پہلے یونانیوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔ علم فلکیات میں بہت معمولی طور پر مثلثات سے یونانیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کی تکمیل کر کے مسلمانوں نے اس کو ایک مستقل علم قرار دیا۔

یورپ والوں کا خیال ہے کہ "جون نیپر" نے "لگاریتم" کا انکشاف کیا ہے حالانکہ اس سے چھ سو سال پہلے عبدالرحمان ابن یونس صفدی نے

"لگاریتم" سے فائدہ اٹھایا۔

۲۱۔ اسلام نے دنیا میں آکر جہاں بہت سی جہالتوں اور خرافتوں کا قلع قمع کیا وہاں علم نجوم کو بھی اس نے لغو اور مہمل قرار دیا مسلمانوں نے اس کے بجائے علم ہیئت کی طرف توجہ کی۔ مورخین نے بتایا ہے کہ یورپ کے کالجوں میں سولھویں صدی تک علم نجوم کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔

علم ہیئت نے مسلمانوں کے ذریعہ عروج پایا، انہوں نے اس میں اپنے گراں قدر تحقیقات سے چار چاند لگا دئے۔ ابن طفیل فیلسوف اندلسی نے داستان حی ابن یقظان میں کرویت زمین پر واضح طور سے استدلال کیا ہے۔ فرغانی کی کتاب" جوامع علم النجوم والحرکات السماویۃ" کے لاطینی ترجمہ کو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک علماء یورپ کے درمیان ماخذ و مدرک کی حیثیت حاصل رہی۔

فرغانی نے سمندر کے مدّو جزر میں چاند کے اثرات کی بابت نہایت گرانقدر وضاحتیں کی ہیں۔ ابوعبداللہ بتانی نے جو یورپ میں "البیٹانس" کے نام سے مشہور ہیں آفتاب کی جائے طلوع و غروب کے بارے میں بہت دقیق تخمینہ قائم کیا ہے۔

"گوستاولوبون" نے لکھا ہے کہ مدار سیارات کے بیضوی ہونے اور آفتاب کے گرد زمین کے —— حرکت کرنے کی بابت" کیلر" اور" کپرنیک" سے بہت پہلے علماء اسلام انکشاف کر چکے تھے۔ اس کے

بعد مسلمان ہیئت دانوں کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ مثلاً ابوالفداء دسویں صدی کا مشہور عالم ہیئت، محمد و احمد و حسن پسران محمد ابن شاکر نویں صدی کے یگانۂ روزگار ہیئت دان۔

۱۴۔ صنعت و زراعت کے شعبوں میں بھی مسلمانوں کی کارگزاریاں علمی و فلسفی کارگزاریوں سے کم نہیں تھیں۔ اس کا ایک جاندار شاہد یہ ہے کہ اسپین کی صنعتی و زراعتی حالت کے لحاظ سے مسلمانوں کے دورِ حکومت اور عیسائیوں کے زمان سلطنت کے درمیان زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

تاریخ تمدن اسلام کے مؤلف نے کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ صرف اسپین کے ایک شہر اشبیلیہ میں مسلمانوں کے قائم کردہ ایک ہزار چھ سو کارخانے تھے جن میں ایک لاکھ بتیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے جانے کے بعد صرف تین سو کارخانے باقی رہ گئے۔

شہر "طلیطلہ" میں کپڑا بننے کے پچاس کارخانے تھے جن میں سے عیسائیوں کے دورِ حکومت میں فقط تیرہ کارخانے رہ گئے۔ اور ابریشم بافی کا کارخانہ جس میں چالیس ہزار آدمی بیک وقت کام کرتے تھے بالکل بند کر دیا گیا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ رنگ سازی، فولاد سازی اور مختلف قسم کی دھاتوں کے زمین سے نکالنے میں مسلمانوں نے

بڑی مہارت پیدا کر لی تھی۔ کاغذ گو چینیوں کی ایجاد ہے لیکن روئی سے کاغذ سب سے پہلے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ چینی ابریشم سے کاغذ تیار کرتے تھے جس کے مہنگے ہونے کی بنا پر عام لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ روئی سے کاغذ کی تیاری نے علوم و فنون کی ترقی و حفاظت میں بڑی مدد کی قطب نما کو غیر مسلموں نے ایجاد کیا ہے لیکن دریائی سفر میں اس سے فائدہ اٹھانا مسلمانوں نے دنیا کو سکھایا ہے۔ مسلمانوں کے اس انکشاف کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس نے تجارت اور کشتی رانی کے طریقہ میں عظیم تبدیلی کر دی۔ زمین کے نہایت اہم حصوں کا پتہ چلانے میں بہت ہاتھ بٹایا۔

مشین سازی میں مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہارون رشید نے شارلمان کے واسطے دوسری صدی ہجری میں خود کار ٹائم پیس بطور تحفہ بھیجی تھی۔ "لی بر دسو" نے لکھا ہے کہ اہل یورپ نے اس گھڑی کو عجائب دنیا میں آٹھواں نمبر دیا۔ گھڑی کی بالکمانی کو جو جدید مشین سازی میں بڑا اہم پرزہ سمجھا جاتا ہے مسلمانوں نے ایجاد کیا ہے۔

علمی تجربات کے سلسلہ میں پنڈول کو ابن یونس مصری نے چوتھی صدی ہجری میں ایجاد کیا اور اس کے بعض اصول اسی نام کے دوسرے مسلمان شخص نے ۶۷۰ھ میں "گالیلہ" سے

چارسو سال پہلے بنائے۔

تاریخ دانوں کا بیان ہے کہ مسلمانوں کے اسپین سے نکالے جانے کے بعد وہاں کی نہ صرف صنعتی حالت خراب ہو گئی بلکہ کھیتی باڑی پر بھی بہت برا اثر پڑا۔ ان اعداد و شمار کی بنا پر جنہیں "لوکا مالادا" نے انیسویں صدی کے اواخر میں بتایا ہے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے اسپین چھوڑنے کے بعد وہاں کی اراضی صرف دس فیصدی زیر کاشت رہ گئی تھی ۴۵ فیصدی بالکل ویران اور بقیہ نیم ویران تھی۔

۱۴۔ مسلمانوں کی ذکاوت و ذہانت کا مظاہرہ دوسرے علوم و فنون کی بہ نسبت علم فزیک کے سلسلہ میں زیادہ ہوا ہے اُن سے پہلے اس علم میں بجائے تجربہ اور آزمائش کے صرف مفروضات سے کام لیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں تحقیقات کی بنیاد تجربہ اور آزمائش پر سب سے پہلے مسلمانوں نے رکھی ہے۔

"گوستاولوبون" نے اپنی کتاب "تمدن اسلام و عرب" میں لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور ہے کہ "بیکن" وہ پہلا شخص ہے جس نے تجربہ کو اسلاف کے اقوال و مفروضات پر ترجیح دی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خیال کو "بیکن" نے نہیں بلکہ مسلمانوں نے پیدا کیا ہے۔

ڈاکٹر عمر فروخ نے اپنی کتاب "عبقریۃ العرب" صراحت کی ہے کہ ابن سینا اور ابن ہیثم نے آنکھ اور دیکھنے کے بارے میں بہت ہی

خاص تحقیقات کیئے ہیں۔ آنکھ کی بابت ابن ہیثم کے نظریات انہی کے نام سے یورپ میں اس وقت بھی مشہور ہیں۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فضا میں نور کی سیر منحنی کا انکشاف کیا۔ یورپ میں ان کی شہرت " الہیزم " کے نام سے ہے۔

ابن ہیثم نے شکستِ نور کے سلسلہ میں اپنے مخصوص نظریات کا اظہار کیا۔ ان کی تحقیقی روش سے " بیکن " اور " کپلر " کی علمی ترقیوں پر متاثر ہوئیں۔ جرمنی عالم " فیتلو " کے تحقیقات کو یورپ والے قدیم صحیح ترین تحقیقات کا مرتبہ دیتے ہیں۔ " فیتلو " نے ایک کتاب " مناظر " کے نام سے لکھی جس سے " کپلر " نے غیر معمولی فائدہ اٹھایا اس کتاب کو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ ابن ہیثم کی کتاب " المناظر " کا مکمل ترجمہ سمجھنا چاہیے۔

ابن ہیثم پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے تجربات میں تاریک کمرہ سے کام لیا جسے آلہ تصویر کشی کیمرہ کی بنیاد سمجھا جاتا ہے وہ اس اصل جبر سے پوری طرح واقف تھے جس کی شہرت " نیوٹن " کے قانون اوّل سے ہوئی، شکست نور کے قانون اول کو انہوں نے دریافت کیا، نیز اس کے قانون دوم کی بابت بھی انہوں نے بحث کی ہے۔

ڈاکٹر مصطفوی کا کہنا ہے کہ نور کا نظریۂ موجی اور اس کی مثالیں جنہوں نے یورپ میں " ہویگنز " کے نام سے شہرت پائی اور جس

کو خود اس نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کیا ابن ہیثم کی کتاب "المناظر" کی ایک عبارت کا پورا پورا ترجمہ ہے۔ یہ مسلمان عالم ابن ہیثم "ہویگینز" سے صدیوں پہلے گزرا ہے۔

ڈاکٹر مصطفوی نے مجلہ "دنیائے علم" میں وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ "ڈکارٹ" اور "نیوٹن" نہ صرف یہی کہ ذرۂ نور کی تھیوری کے موجد نہیں تھے بلکہ ان کے تمام نظریات و تجربات مسلمانوں سے ماخوذ ہیں۔

کتاب "میراث اسلام" کے حصّہ علوم طبیعی کے مؤلف "ماکس میرہوف" نے صراحت کی ہے کہ "روجر بیکن" اور دوسرے یورپین علماء نے مسئلہ نور میں جو نظریات پیش کئے ہیں ان کا ماخذ ابن ہیثم کی کتاب "المناظر" ہے۔

۱۵۔ یہ انقلاب زمانہ کی کرشمہ سازی ہے کہ آج مسلمان اپنے ادبی تخلیقات میں یورپ کے ادباء و شعراء کا چربہ اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا نام ترقی پسند ادب رکھا گیا ہے، ایک وقت تھا کہ اہلِ یورپ ادبیات میں مسلمانوں کی تقلید و پیروی کو اپنا فنی کارنامہ سمجھا کرتے تھے۔ کتاب میراث اسلام کے حصہ ادبی کے مؤلف پروفیسر "گیپ" کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے اہلِ یورپ کے واسطے ادبیات کا ایک نیا راستہ بنایا۔ یورپ کی تمام ادبی ترقیوں کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ فرانس کے شعراء عربی اسلوب شعر کی فخریہ نقل کیا کرتے تھے۔

۱۶- فلسفۂ اجتماع میں اگرچہ مسلمان فلسفی فارابی کا درجہ بہت اونچا ہے لیکن فلسفہ تاریخ و اجتماع کے سلسلہ میں عظیم ترین شخصیت جس کو اس علم کا مؤسس کہنا بالکل درست ہے ابن خلدون کی ذات ہے۔ ان کے مقدمہ کی اشاعت سے پہلے اہلِ یورپ "دیکو" کو فلسفۂ اجتماع و تاریخ کا بانی سمجھتے تھے بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ "دیکو" سے ساڑھے تین سو سال قبل ابن خلدون نے اس علم کی مکمل بنیاد رکھدی ہے۔

کتاب "دراسات عن مقدمۃ ابن خلدون" کے مؤلف ساطع الحصری نے لکھا ہے کہ "منتسکیو" کی مشہور عالم کتاب "روح القوانین" کے تمام علمی مباحث کا نچوڑ مندرجہ ذیل دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

(۱) رفتار تاریخ اور روحانیات اقوام میں تربیت و ماحول کے اثرات

(۲) تاریخی و اجتماعی واقعات میں اقتصادی حالات کی کارفرمائی۔

پہلے نظریہ کی بابت یونانی اور اسلامی فلاسفہ گزشتہ صدیوں میں مکمل تحقیق کر چکے ہیں۔ دوسرے نظریہ کے متعلق یورپ والوں کا خیال ہے کہ وہ "منتسکیو" کی تخلیق ـــــ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "منتسکیو" سے تین سو پچاس برس پہلے ابن خلدون نے اس نظریہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، چنانچہ "وارڈ" نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ لوگوں کا خیال تھا کہ جماعتی زندگی کی رفتار جبری کے نظریہ کی تشریح پہلی بار "منتسکیو" یا "دیکو" نے کی ہے حالانکہ

ابن خلدون ـــ ان سے مدتوں پہلے اس کی بابت مفصل بحث کر چکے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ناقابل تغیر قوانین کے پیچھے پیچھے آگے بڑھتی ہے۔

موجودہ یورپین فلسفی" واشمیت" نے اعتراف کیا ہے کہ فلسفہ اجتماع و تاریخ میں ابن خلدون کے بلند و عظیم مرتبہ تک" اگوست کنت" انیسویں صدی میں جب کہ تمام علوم و فنون ترقی کر چکے تھے نہیں پہنچ سکا تھا۔ اہل یورپ کو تصوّر ہے کہ" اگوست کنت" نے علم اجتماع کی داغ بیل ڈالی ہے حالانکہ اس کے پیش کردہ تمام اصول و نظریات کی توضیح اس سے قبل ابنِ خلدون نے کر دی ہے۔

۱۷۔ اسلام کے زیرِ حمایت مسلمانوں نے جو علمی ترقیاں کیں وہ اس وقت مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں جب اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے کتب خانوں پر ہماری نگاہ پڑتی ہے اس بارے میں صحیح اندازہ کے لئے اتنا بتا دینا کافی ہے کہ" گوستا ولوبون" نے ابن سنبدی سے نقل کیا ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں قاہرہ کے کتب خانہ میں صرف ہندسہ نجوم اور فلسفہ کی ساڑھے چھ ہزار کتابیں موجود تھیں۔

" بی یر روسو" نے لکھا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں قرطبہ کی دس لاکھ آبادی کے واسطے اسّی کالج مع کتب خانوں کے قائم تھے جن میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ اس وقت فقط ع.بی بین الاقوامی و عالمی

زبان سمجھی جاتی تھی۔

مؤرخین اسپین سے مسلمانوں کے نکال دئے جانے کے بعد وہاں کے عمومی انحطاط و تنزل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ملک جس نے اپنے علم و معرفت کے نور سے ساری دنیا کو روشن کر دیا تھا علم طبیعی و ریاضی کی تعلیم کے واسطے ایک مدرسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا تھا اس کے برعکس اسی اسپین میں مسلمانوں کے دورِ حکومت و اقتدار میں مدرسوں کا ایک جال بچھا نظر آتا ہے۔ جہاں دینی و دنیوی تمام علوم و فنون کے کلاس طلبہ سے جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فقط فارابی کے حلقہ درس میں سیکڑوں آدمی شریک ہوتے تھے۔

اسلام کی علمی و فنی ترقیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اُسے اس سلسلہ کا ایک معمولی اور سرسری خاکہ سمجھنا چاہیے۔ اختصار کا لحاظ کرتے ہوئے علوم و فنون کے میدان میں مسلمانوں کی مکمل پیشرفت کا نقشہ نہیں کھینچا جا سکا۔ یہ واقعہ ہے کہ انہی گرانقدر ترقیوں کی بنیاد پر یورپ کے تمام علمی تحقیقات کا فلک بوس قصر تعمیر ہوا۔ ”رے سانس“ کی علمی تحریک اسلامی تعلیمات کے سایہ میں پروان چڑھی۔ اسلام نے اہل یورپ کی آنکھوں کو کھول دیا ورنہ وہ جہالت و بے خبری کے اندھیروں میں ہمیشہ ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے رہتے۔

یقیناً یہ تاریخی حقائق ہمارے ان مسلمان نوجوانوں کے

لئے بڑے حیرت انگیز ہیں جن کا خیال ہے کہ تمام علمی و صنعتی ترقیاں مغرب کی کوششوں کی مرہونِ منّت ہیں۔ اور جس قوم کے پاس جو کچھ ہے وہ اہلِ مغرب کی داد و دہش کا نتیجہ ہے ہم اپنے نوجوانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اسلام اور مسلمانوں کی ابتدائی صدیوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں تو ان کے سامنے ہمارے بیان کردہ حقائق چمکتے ہوئے سورج کی طرح جھلکنے لگیں گے۔ یہ مطالعہ قطعاً ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے نظریہ اور فیصلہ کو بدل دے گا۔[۱]

پھر یہ کایا پلٹ کیسا؟

اسلامی تعلیمات اور اُن کی روشنی میں خالص دنیاوی علوم و فنون کے لحاظ سے اسلاف کی غیر معمولی ترقی کے مقابل مسلمانوں کی موجودہ پستی واقعتاً انسان کو بھونچکا بنا دیتی ہے ایک طرف مسلمانوں کا وہ شاندار و درخشاں ماضی اور دوسری طرف انہی کا یہ تاریک و مایوس کن، بھیانک اور ہولناک حال!!

انحطاط و تنزل کی مردنی تمام مسلمان قوموں کے چہروں پر چھائی ہوئی ہے۔ ہر طرف افراتفری، افتراق و اختلاف کی بلا اُن کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ہر قسم کے ضروریات زندگی کی فراہمی

---

[۱] اس عنوان کے ذیل میں جو معلومات درج کئے گئے ہیں ان کا ایک حصہ مجلہ مکتب اسلام میں شائع شدہ مقالہ "نہفت علمی مسلمانہا" سے ماخوذ ہے

ہیں وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔ تمام اعلیٰ دنیوی علوم و فنون میں غیر مسلم قوموں کے دروازے کی گدائی کر رہے ہیں مسلمانوں کی نااہلیت و ناقابلیت نے اُن کے وطنوں کی دولت سے اغیار کے گھروں کو بھر دیا ہے۔

مسلمانوں کی پستی و تنزلی کا نقشہ ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہے وہ کوئی ایسی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے جسے ابھارنے اور نمایاں کرنے کی ضرورت ہو۔ ارباب فکر و نظر کو اس کے صحیح اسباب کی کھوج کرنا چاہیے تاکہ ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ سرسری تلاش و جستجو کے بعد مندرجہ ذیل اسباب کی طرف ذہن دوڑتا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہوں جن کی جانب ہماری توجہ نہ ہوئی ہو۔

(۱) پہلا سبب جس کا مسلمانوں کے انحطاط و تنزل میں سب سے زیادہ دخل ہے وہ اُن کی متحدہ اسلامی حکومت کا ٹوٹ جانا ہے بلا حکومت کے قوم میں تنظیم نہیں پیدا ہو سکتی۔ بلا تنظیم کسی مقصد کو لے کر اجتماعی طور پر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ حکومت ٹوٹ جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں انتشار و خلفشار پیدا ہو گیا۔ پوری قوم کو کسی ایک لائحہ عمل کا پابند بنانا مشکل ہو گیا۔ اسلامی تعلیمات اپنی عملی پابندی کی خاموش دعوت دیتے رہے لیکن اُن کے پاس اپنے قانونی طور سے نفاذ و اجراء کے لئے کوئی طاقت نہیں رہی۔ اسلام کا اقتصادی نظام کسی حکومت کے

پشت پناہ نہ ہونے کی وجہ سے روبکار نہ آسکا۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ افلاس و غربت نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا، فقیری و مفلوک الحالی ان کا قومی نشان بن گئی دنیاوی علوم و فنون دولت ہی کے سہارے ترقی کرتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھ مال دنیا سے بالکل خالی گئے۔

یہ حقیقت تلخ سہی لیکن ناقابل انکار ہے کہ اسلام کی اصلی و صحیح معاشی منصوبہ بندی کو رسولؐ کے بعد علی ابن ابی طالبؑ کو ایسی مسلسل خانہ جنگیوں میں الجھا دیا گیا جن کے ساتھ اسلامی نظام کا کامل طور سے آزادانہ اجرا ممکن نہیں رہا۔ داخلی نظم و نسق کی درستی سکون و اطمینان کے لمحات میں ہوا کرتی ہے جب گھر میں آگ لگی ہو تو اس کی زینت و آرائش کا دھیان کیونکر رکھا جاسکتا ہے۔

اگر تعلیمات اسلامی کے حقیقی واقف کار اور شرح مذہب کے سچے دمساز و ہم راز افراد کے ہاتھوں حاکمانہ اقتدار و تسلط ہوتا تو مسلمانوں کی خوش حالی و فارغ البالی دنیا کے لئے قابل رشک ہوتی اور دنیاوی علوم و فنون میں بھی وہ اقوام عالم کی قیادت و سربراہی کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کے واسطے دنیوی ترقیوں پر قدغن نہیں لگایا ہے بلکہ حدود شریعت کے اندر رہ کر ان کے دروازے اپنے والوں کے لئے پاٹوں پاٹ کھول دیئے ہیں۔

ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے قانونِ اسلام دنیاوی علوم و فنون کی ترقی کا ذمہ دار براہِ راست حکومت کو قرار دے دے۔ جامعۂ اسلامی کا تحفظ حکومت کا فریضہ ہے اسلام کے مخالف عناصر جب ان علوم و فنون میں برابر آگے بڑھتے رہیں گے اور مسلمان اس میدان میں کوئی تگ و دو نہیں کریں گے تو باطل کا غلبہ حق پر یقینی ہے۔ گولی کا مقابلہ تیر سے اور ایٹم کا جواب منجنیق سے نہیں ہو سکتا۔ ٹینکوں کے ریلے کو نیزوں کی انیوں پر نہیں روکا جا سکتا۔ اسلام کو اپنے تحفظ کے لئے وہی راستے اختیار کرنا پڑیں گے جن پر اس کی مخالف طاقتیں گامزن ہونگی۔ ان تمام علوم و فنون کی نشوونما اور ترقی کا فرض حکومت کے اوپر عائد ہوتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے بقاء و تحفظ کے لئے ضروری ہوں۔

یہ بھی واضح ہے کہ مسلمانوں کی مردم شماری کے بڑھنے سے ضروریاتِ زندگی کی مقدار میں اضافہ کی احتیاج ہے۔ اس عظیم مقدار کو گھریلو، معمولی انفرادی دستکاریوں سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ بڑے بڑے کارخانوں اور فیکٹریوں کے بغیر پوری جماعت کے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ ان ضروریات کو دوسرے ملکوں سے حاصل کرنے میں باطل کی اعانت و تقویت ہوتی ہے جو قانونِ اسلام میں ممنوع و حرام ہے۔ یقیناً اس سلسلہ میں صورتِ حال کے لحاظ سے مناسب انتظام و اقدام اسلامی

حکومت کی طرف سے ہو گا۔ اس بار کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے والے افراد کی حکومت خندہ پیشانی سے مدد کرے گی۔ اور ضرورت محسوس ہونے کی صورت میں براہِ راست خود بھی ہر خدمت کے لئے تیار رہے گی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیوی شعبوں میں مسلمانوں کی ترقیوں کو اسلام دشمن عناصر ناپسند کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان ملک کے کچھ عوام یا وہاں کی خود حکومت اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے ناکام بنانے میں دشمنوں کی طرف سے ہر قسم کی ریشہ دوانیاں کی جاتی ہیں۔ قابلِ افسوس یہ ہے کہ انہیں اس بارے میں خود سامنے آنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مسلمانوں ہی میں سے انہیں ایسے افراد مل جاتے ہیں جن کو وہ اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں۔

اسلام دشمن عناصر کی کامیابی کا راز صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی دین پرست اسلامی حکومت نہیں رہی۔ اگر اسلام پرور، متدین مسلمانوں کے ہاتھوں میں اقتدارِ حکومت ہوتا تو نہ وہ فروخت ہو کر غیروں کا آلۂ کار بن سکتے تھے اور نہ ان کے۔ عوام کی اخلاقی پستی و کمزوری کا سبب یہ ہے کہ حکومتی پیمانہ پر اُن کی تربیتِ اخلاق کا کبھی کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ علماء واعظین کو جب حکومت کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے تو اُن کی آواز میں کیا زور کیا اثر پیدا ہو سکتا ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اسلامی حکومت کے جو خطوط کھینچ دئے تھے مسلمان اگر انہی کی پابندی کرتے اور اپنی دخل اندازی سے باز رہتے تو مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ دین جاتا اور نہ دنیا۔ انھوں نے اپنے رسولؐ کے بنائے ہوئے راستہ کو چھوڑ کر دین کے ساتھ اپنی دنیا کو بھی بگاڑ لیا۔

میرا خیال ہے جو یقیناً حقیقت کے مطابق ہے کہ رسولؐ کی وفات کے بعد اگر حکومت و اقتدار آنحضرتؐ کے اہلبیت کے پاس رہتا تو مسلمان آخرت کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی کے بھی ہر شعبہ میں اقوام عالم کے لئے مثال اور نمونہ ہوتے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں تمام دنیوی علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقیاں اسلامی تعلیمات ہی سے کسی حد تک متاثر ہو کر وجود میں آئی ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت و اقتدار براہ راست اُن افراد کے ہاتھ میں ہوتا جو اسلامی تعلیمات کا عملی مجسمہ تھے تو مسلمانوں کی دینی و دنیوی بلندیوں کا کیا عالم ہوتا۔

(۲) مخالفین اسلام نے اپنے دورِ اقتدار و حکومت میں یہ بڑی گہری اور زہریلی دسیسہ کاری اور چالاکی کی کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اچھی طرح یہ راسخ کر دیا کہ مذہب کا تعلق بس انسان کی انفرادی زندگی سے ہے، مذہب بس خاص طرح کی کچھ عبادتوں کا نام ہے اُسے انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسلام

کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اُس کا پیرو نماز، روزہ، حج، خمس و زکوٰۃ کی پابندی کرے۔ اس کے علاوہ اُس کے ذمہ اسلام کی طرف سے نہ کچھ اخلاقی فرائض ہیں اور نہ اجتماعی پابندیاں۔ حالانکہ اسلام ہی وہ منفرد مذہب ہے جو انسان کے روحانی و جسمانی تمام تقاضوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو ہر طرح سے مکمل اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسلمانوں کے متعلق اعلان کر رہا ہے۔ وقیل للذین اتقوا ماذا انزل ربکم ط قالوا خیرا ط للذین احسنوا فی ھٰذہ الدنیا حسنۃ ط ولدار الاٰخرۃ خیر ط ولنعم دار المتقین۔ "جب پرہیزگاروں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں کہ سب اچھا ہی اچھا ___ خدا کے نیکوکار بندوں کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو اُن کے واسطے اچھا ہے ہی۔ پرہیزگاروں کا یہ گھر کیسا عمدہ ہے"

پیغمبر اسلام نے صاف لفظوں میں فرمادیا لیس خیرکم من ترک دنیاہ للاخرتہ لدنیاہ بل خیرکم من اخذ من ھٰذہ وھٰذہ۔" وہ شخص کسی تعریف کا مستحق نہیں ہے جو آخرت کو دنیا کے لئے اور دنیا کو آخرت کے لئے چھوڑ دے بلکہ بہترین آدمی وہ ہے جو دنیا و آخرت دونوں سے فائدہ اٹھائے" مسلمان اپنے رسولؐ کا یہ ارشاد بھول گئے ان من فقہ ارجل استصلاح معیشتہ ولیس من حب الدنیا طلب

مایصلحک ۔" اپنی معاشی زندگی کو درست کرنا انسان کی دانشمندی ہے، اسے حب دنیا پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔" قرآن مجید نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ لاتنس نصیبک من الدنیا۔" خدا کی طرف سے دنیا میں جو حصہ تمہارا مقرر کیا گیا ہے اُسے فراموش نہ کرو۔"

اسلام دنیاوی زندگی کی نشو ونما کے لئے جدو جہد پر مسلمانوں کو اسی طرح ابھارتا ہے جس طرح حیات اخروی کی اصلاح و ترقی کے واسطے۔ ارشاد ہوا کہ اعمل لدنیاک کانک تعیش ابدا و اعمل لاخرتک کانک تموت غدا۔ دوسرے مقام پر حکم دیا گیا۔ اصلحوا دنیاکم واعملوا لاخرتکم کانکم تموتون غدا۔" دنیا اور آخرت دونوں کے لئے کام کرو ہاں فرق یہ ہے کہ دنیاوی کاموں میں زیادہ جلدی کی ضرورت نہیں ہے اور آخرت کے اعمال میں عجلت کرنا چاہیے۔"

تجارت اور صحت کی غرض سے سفر کی طرف توجہ دلائی گئی — سافروا تصحوا و تغنموا خصوصی طور سے تجارت اور کسب معاش کے سلسلہ میں ارشاد ہوا کہ رزق کے نو حصے خدا وند عالم نے تجارت میں قرار دئے ہیں تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ۔ اسلام نے یہاں تک کیا کہ ہماری رسمی عبادتوں کے مقابلہ میں کسب حلال کو اہمیت دے دی۔ فرما دیا گیا العبادۃ عشرۃ اجزاء تسعۃ منھا فی طلب الحلال۔ اسلام ترک دنیا کر کے عبادت میں پوری زندگی صرف کر دینے کو ناپسند کرتا ہے من تبتل فلیس منا۔

" تارک الدنیا لوگوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے "

یہ ظاہر ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے لئے اپنے مختصر دورِ حیات میں اس کا موقع نہ تھا کہ دنیوی زندگی کے سلسلہ میں آپ نے مسلمانوں کو جو ہدایات فرمائے تھے انہیں خود عملی جامہ پہناتے۔ آپ کے بعد آنحضرتؐ کے اہلبیت کو عام مسلمانوں نے اپنا رہنما اور قائد تسلیم نہیں کیا لہذا اس بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو عملی طور سے بروئے کار لانے کا خود مسلمانوں نے موقع نہیں دیا۔

یقیناً مختلف اوقات میں مسلمان حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں۔ لیکن حاکمانہ اقتدار ایسے افراد کے ہاتھ میں رہا جو اسلام کے حقیقی مفہوم سے پورے طور پر یا واقف نہیں تھے اور یا اُس پر عمل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اسلامی تعلیمات کو مستقل اور دائمی حیثیت سے عملی جامہ پہننا نصیب نہیں ہوا۔ رہ گئے خود مسلمان اُن کو اسلام کے صحیح معنی و مفہوم سے مخالف عناصر نے غافل بنا کر اپنی دینوی زندگی کے شعبوں کی اصلاح و ترقی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

اسلام کا یہ ایک جامع مختصر اور پرمعنی حکم اطلبوا الرزق فی خبایا الارض " زمین کی باطنی تہوں میں اپنا رزق تلاش کرو " مسلمانوں کی معاشی حالت میں انقلاب لانے کے لئے کافی تھا اور کافی ہے ظاہر ہے کہ سارے معدنیات اور بالخصوص تیل کے خزانے زمین ہی

کی تہوں میں پوشیدہ ہیں۔ اسلام کا یہ حکم اُن سے فائدہ اٹھانے کی طرف عام توجہ دلاتی ہے۔

کتنی قابلِ افسوس بات ہے کہ مسلمان ان اسلامی ہدایات سے غافل رہے اور غیروں نے اِن اشاروں کو سمجھ کر اُن کے مطابق عمل شروع کر دیا۔ اغیار آگے بڑھتے رہے اور مسلمان پیچھے ہٹتے ہٹتے تنزل و انحطاط کے گڑھے میں ایسے گرے کہ اب اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔

اسلام دین اور دنیا میں کسی تفریق کا قائل نہیں ہے اُس کے سچے ماننے والوں کی قرآن مجید میں یہ آواز گونج رہی ہے۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة " بار الہا! ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی عطا فرما" اسلام مسلمانوں کو دو حصوں میں بانٹنا نہیں چاہتا۔ کہ ایک گروہ کا نام دیندار ہو اور دوسرے کا دنیادار یہ تقسیم روح اسلام کے بالکل منافی ہے وہ دین و دنیا کو سمونے کے لئے آیا ہے۔ اُس کے پیغام میں دنیا اور آخرت کا وہ حسین امتزاج نظر آتا ہے جس نے اُسے تمام ادیان عالم سے ممتاز بنا دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک ہر وہ دنیاوی کدو کاوش جس میں خالق کی رضا جوئی مدنظر ہو حقیقی زہد و تقویٰ ہے۔ حکیم اسلام امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کا صاف اعلان ہے۔ من اخذ الدنیا بما فیها فاراد بها وجه الله فهو زاهد و من ترک الدنیا و ما فیها و لم یرد به وجه الله فهو

لیس ہذا ھذ۔

کائنات کے مطالعہ اور اس کے رموز و اسرار میں غور و خوض کی طرف اسلام نے انسان کو جس شدت سے متوجہ کیا ہے اس کا اندازہ ہر مسلمان کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں مطالعۂ کائنات پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض تم غور کرو کہ آسمان کی بلندیوں اور زمین کی پستیوں میں کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہیں۔

قرآن مجید اور مطالعۂ کائنات کے سلسلہ میں ایک نہایت مکمل مضمون مولانا سید محسن نواب صاحب کا ماضی قریب میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کے بعد اس کے متعلق مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید نے اس دعوت فکر و نظر کا اصلی مقصد خداوند عالم کی معرفت کو قرار دیا ہے، لیکن اس نے کائنات کے رموز و اسرار کے انکشاف سے مادی و دنیوی زندگی میں فائدہ اٹھانے کا دروازہ انسان کے لئے بند نہیں کیا ہے۔ اس نے آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کا بھی انسان کو حصہ دار بنایا ہے۔ اسلام دنیا فراموشی کا شدید مخالف ہے۔ کائنات کے رموز و اسرار میں غور و خوض کا بنیادی مقصد معرفت الہی کو قرار دے کر اسلام نے انسان کو کفر و الحاد کی تباہ کاریوں سے بچانا چاہا۔ اسرار کائنات کے انکشاف کے ذریعہ انسان جب اپنے خالق کا شناسا بن جائے گا تو

پھر اُس کی مرضی اور اُس کے منشار کا پابند رہے گا۔ کائنات عالم کی پوشیدہ طاقتوں پر قابو پا لینے کے بعد انہیں تخریب کے بجائے تعمیری کاموں میں صرف کریگا۔ وہ اُن کو انسانیت کی تباہی و بربادی کا آلۂ کار نہیں بنائے گا۔ بلکہ اُس کی راحت و آسائش کا وسیلہ قرار دے گا۔

اسلام دشمن عناصر کی یہ جادوگری نہیں تو اور کیا تھی کہ انہوں نے مسلمان کو اتنا سادہ لوح اور بھولا بھالا بنا دیا۔ کہ وہ مطالعۂ کائنات کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اگر زمین، آسمان، چاند، سورج، دریا، پہاڑ، انسان، حیوان کو سرسری طور سے دیکھ لینا معرفت خدا کے لئے کافی ہوتا تو دنیا میں کوئی شخص اُس کے وجود کا انکار نہ کرتا۔ کائنات کے کسی باشعور خالق کا پتہ اسی وقت چل سکتا ہے جب اُس کے رموز و اسرار، اس کی چھپی ہوئی حکمتوں اور مصلحتوں کا غور و فکر کی مدد سے انکشاف کیا جائے۔

اس میں کیا شبہ ہے کہ اگر مطالعۂ کائنات کا مقصد معرفت خدا کو قرار دے کر آگے بڑھا جائے تو سائنس انسان کو مذہب سے دور کرنے کے بجائے اس سے قریب تر کر دے بمقصد بدلنے سے ایک ہی عمل کے نتائج بدل جاتے ہیں۔ مزدور صبح سے شام تک اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دیتا رہتا ہے لیکن اس کی جسمانی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور ایک پہلوان کچھ دیر وہی عمل کرتا ہے جس سے اُس کے جسم کی

شکل میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک مسافر اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کی دھن میں بڑے بڑے حسین و دلفریب مناظر کو دیکھتا گزر جاتا ہے لیکن اُسے کچھ لطف نہیں آتا مگر یہی جب اپنے گھر سے سیر و تفریح کی غرض سے ان راستوں پر چلتا ہے تو وہاں کے مناظر کو دیکھ کر اُس کا دل باغ باغ ہو جاتا اور دماغ فرحت و نشاط کی کیفیتوں سے بھر جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے مطالعۂ کائنات مادی فوائد و منافع کے پیش نظر کیا انہیں خدا کی معرفت حاصل نہ ہوئی بلکہ وہ مذہب سے دور ہو گئے۔

قرآن مجید نے وجود خدا کے اثبات میں خالص عقلی و فلسفی دلیلوں سے بہت کم مدد لی ہے۔ اُس نے انسان کو معرفت خدا کے لئے اکثر و بیشتر مقامات پر اسرار کائنات میں غور و فکر کی طرف دعوت دی ہے غالباً اس کا سبب یہی ہے کہ وہ انسان کی دینی و اعتقادی اصلاح کے ساتھ اُس کو دنیوی زندگی کے بھی بام عروج پر پہونچانا چاہتا تھا۔ مسلمانوں کو اس نکتہ کی طرف یا متوجہ نہیں ہونے دیا گیا اور یا توجہ کے باوجود اقدام و عمل کی منزل میں اُن کے لئے ایسی زبردست رکاوٹیں پیدا کر دی گئیں کہ وہ سائنس کے میدان میں دو چار قدم بھی نہیں چل سکے۔ وہ اپنے تمام ضروریات زندگی میں غیر مسلم طاقتوں کے دست نگر ہو گئے۔ وہ ایک محتاج، اپاہج کی طرح دوسروں کے دروازے کے بھکاری بنے ہوئے ہیں۔ کوئی مسلمان ملک اپنی کفالت پر خود قادر نہیں ہے

وہ سب کے سب دوسرے ممالک کی چلتی ہوئی تجارتی منڈیاں ہو کے رہ گئے ہیں۔ اُن میں سے کسی کے مکمل طور سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایسا بلا مسلط طاقتوں سے تصادم اور کشمکش کے ممکن نہیں ہے۔ بھلا اُن قوتوں سے ٹکر لینے کا کیا سوال جو لڑنے کے لئے ہتھیار بھی خود ہی بنا کر ہمیں دیتے ہیں!!

نتیجۂ کلام

اب تک جو کچھ لکھا گیا اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علوم طبیعی کی روز افزوں ترقیوں نے جہاں نوع انسانی کی قابل قدر خدمت کی ہے جہاں اُس کی بہت سی اجتماعی واقتصادی گرہوں کو کھولا ہے جہاں اس کے آرام و راحت کا غیر معمولی سامان مہیا کیا ہے وہاں اُس کی زندگی میں بہت سے اہم مشکلات بھی پیدا کر دئے ہیں جنہیں اُن کے ناخن تدبیر حل نہیں کر سکتے۔ ان مشکلات کا دائرہ اگر علوم طبیعی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتا رہا تو انسان ایسی عظیم فیصلہ کن تباہی سے دوچار ہو جائے گا۔ جس کی ڈراؤنی پرچھائیاں آج بھی گاہے گاہے دل دہلانے کے لئے لرزا لرز کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔

ان مشکلات کے علل و اسباب کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔

نیز واضح شواہد و دلائل سے مدد لیتے ہوئے ثابت کیا گیا کہ ان مشکلات کا براہِ راست تعلق موجودہ علمی و صنعتی ترقیوں کے ساتھ ہے۔ ان کو حل کرنے کا بس یہی راستہ ہے کہ انسان اخلاق و ایمان کے دامن میں پناہ لے۔ مذہب سے بھاگ کر اس کے لئے ابدی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ضمناً یہ بھی واضح ہو چکا کہ مذہب اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مذہبی تعلیمات کے بغیر اخلاقی معیار کی بلندی ممکن نہیں ہے۔ اصلاحِ اخلاق مذہب کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے نہ ملکی و قومی لیڈر اس کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتے ہیں۔ اور نہ اخبارات و مطبوعات۔ آخر میں مذہب سے عوام کی بے تعلقی کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی۔

مندرجہ حقائق کی روشنی میں یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ موجودہ علمی و صنعتی ترقیوں کے دور میں حقیقی راحت و اطمینان کے زیر سایہ زندگی بسر کرے، اگر اس کی خواہش ہے کہ جدید تہذیب و تمدن کے نقصان رساں پہلوؤں سے محفوظ رہے تو اُس کا فرض ہے کہ ایمان و اخلاق کے مخالف عناصر سے ٹکر لینے کے لئے طوفانی عزم و ہمت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو۔ تمام باطل حکومتوں سے بغاوت کر کے مذہب اور اخلاق کی ہمہ گیر حکومت کا پرچم لہرا دے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اُس عبرتناک انجام کا منتظر رہے جس کے آثار عالم کے گوشہ گوشہ سے جھلک رہے ہیں ۔!!